

ہر فن ممولاً



پروفیسر محی الدین حاجی

(تاریخی، علمی و تحقیقی مطالعہ)

شاہد شفیق

ہر فن مؤلاً
پروفیسر محی الدین حاجی
(تاریخی، علمی و تحقیقی مطالعہ)

شا کر شفیق

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN-973-93-30691-44-2

عنوان :- ہرفن مولا پروفیسر محی الدین حاجتی

(تاریخی، علمی و تحقیقی مطالعہ)

مصنف :- شاکر شفیق

سال اشاعت :- ۲۰۱۹

کمپوزنگ :- نذہت خان

قیمت :- تین سو پچاس روپیہ

سرورق :- سید مدثر

زیر اہتمام :- کشمیر بک پرموشن ٹرسٹ

ناشر :- میزان پبلشرز بڈہ مالو سرینگر

9419002212,8494002212,7006773404

انتساب

اپنے والدین کے نام

اللہم ربّ رحمہما کما ربّ یانی صغیرا

فہرست مضامین

	۱۔	فصل اول	
۱۱		حالاتِ زندگی	
۱۲	۱۔	زندگی کا سفر	
	۲۔	فصل دوم	
۳۶		محقق و نقاد حاجتی	
۳۹	۲۔	کتاب الطوا سین کے شارح پروفیسر حاجتی	
۴۸	۳۔	پروفیسر حاجتی کے وہاب	
۶۸	۴۔	کلام دیگرے	
۶۹		(الف) مولوی صدیق اللہ حاجتی	
۷۶		(ب) کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ	
۸۲		(ج) علامہ اقبال اور حلاج	
۹۰		(د) آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی	
	۳۔	فصل سوم	
۹۳		تخلیق کا رجا حاجتی	
۹۴	۵۔	پروفیسر حاجتی کی انشائیہ نگاری	
۹۹	۶۔	پروفیسر حاجتی اور اردو صحافت	
۱۱۲	۷۔	پروفیسر محی الدین حاجتی ایک مکتوب نگار	
۱۲۶	۸۔	جو ہم سمجھے	

چند تاثرات

محی الدین حاجتی علمی تہر، خودداری، صاف گوئی، بے باکی، بے نیازی، کشمیر نوازی اور دیگر گونا گوں اوصافِ جلیلہ کی وجہ ریاست جموں و کشمیر کے معاصر ادبی، علمی اور تہذیبی منظر نامے کی قابلِ رشک علامت بن چکے ہیں۔ وہ ایک ایسے مردِ قلندر تھے جو حق پرستی اور با اصول طرزِ عمل سے ملنے والے مصائب اور مشکلات کو سمجھوتوں کے مراعات سے بہتر پُر لطف اور آرام دہ سمجھتے تھے۔ مغربی علوم اور انگریزی زبان کے ممتاز ماہر ہونے کے باوجود مشرقی طرزِ تمدن کے پاسدار رہے۔ اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کو ٹھکرا کر زندانوں میں رہنے کو ترجیح دی۔ شاید اُس کے ہم عصر ادباء، شعراء اور قلم کاروں میں ایسا اور کوئی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے اُس دور سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور استادوں میں جس شخص کو سب سے زیادہ یاد کیا جاتا ہے وہ محی الدین حاجتی ہی ہے۔

محی الدین حاجتی صاحب ۱۹۹۳ کے پُر آشوب حالات میں رحمتِ حق ہوئے اور جب سے آج تک اُن کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ کئی کتابوں کے علاوہ رسائل اور جرائد کے خصوصی حاجتی نمبرات چھپ گئے۔ اس اعتبار سے عزیزم شاکر شفیع کی در دست تصنیف کوئی اولین کوشش نہ ہونے کی وجہ سے مصنف کے لئے ایک چلن والا کام ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والے قارئین میں ہر کسی کا یہ تقاضا ہوگا کہ انہیں کوئی ایسی نئی بات

ہونی چاہئے جو محی الدین حاجتی کے بارے میں اس سے قبل چھپی ہوئی کتابوں اور رسالوں میں دستیاب نہ ہوں۔ میں نے اس کتابچہ کے مسودے کا غور سے مطالعہ کر کے یہ بات اخذ کی کہ اس تصنیف میں مصنف نے حاجتی کی شخصیت کو مقامی روایات اور ماحول کے تناظر میں نہ صرف باریک بینی سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس میں ایک ایسا Personal Touch پڑھنے کے دوران محسوس ہوتا ہے جو اس سے پہلے لکھے گئے لٹریچر میں اس قدر موجود نہیں ہے۔ حاجتی شناسی کے لئے حاجن شناس اس اعتبار سے ضروری ہے کیونکہ حاجتی صاحب اپنی علمی اور ادبی اور علمی زندگی کا بیشتر وقت وہاب پرے، اسد پرے، مولوی صدیق اللہ کی تخلیقات کو جمع کرنے اور انہیں ایڈٹ کرنے اور شائع کرا کے منظر عام پر لانے میں صرف کیا ہے۔ حلقہ ادب سوناواری حاجن اور ادبی مرکز کمرائز کے بانی بھی محی الدین حاجتی ہی تھے۔ ان دونوں ادبی تنظیموں اور ادارہ اوقات اسلامیہ حاجن کے ساتھ وابستہ رہ کر جو کام اور کارنامے کشمیر کی اس تمدن ساز شخصیت نے انجام دئے ہیں ان کے زندہ جاوید گواہ نہ صرف باشندگانِ حاجن بلکہ اس علاقے کے اکثر درودیوار بھی ہیں۔ نوجوان ادیب، محقق اور سکالر شاکر شفیق نے حاجتی صاحب کی شخصیت اور علمی کاوشوں کو مقامی ماحول کے پس منظر اور نفسیاتی عوامل کے ساتھ جوڑ کر اپنے مطالعے کو سائنسی طریقے پر پیش کیا ہے۔ میں اس جواں سال قلم کار کی صلاحیتوں کے حق میں ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ ان کی یہ تصنیف علمی اور ادبی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کرے گی۔

اخلاص مند

عزیز حاجتی

اپنی بات

ادیب ایک حساس سماجی فرد ہوتا ہے اور ادب کا بہت ہی اہم سماجی سروکار۔ ایک عرصہ سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ ادب اور سماج کا کیا رشتہ ہے۔ مفکرِ اول افلاطون نے تو ادیب کو سماج سے بے دخل ہی کر دیا تھا۔ لیکن جب اُس کے افکار و خیالات کے ساتھ اُس کے شاگرد ارسطو نے ہی اتفاق نہ کیا، دوسرے لوگ کیونکر کرتے۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب نہایت ہی حساس اور ذہین آئینہ ساز۔ ہر جنیون تخلیق کار اپنے ملک و قوم کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ ایک حساس سماجی رکن ہونے کی حیثیت سے ادیب کئی بار سماجی خیالات اور اجتماعی فکری دھاروں کو رخ بدل کر اُن کو نئی سمت عطا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی طے ہے کہ اچھا تخلیق کار کوئی مبلغ یا واعظ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ غیر محسوس طریقے سے انقلاب یا تغیر کیلئے زمین ہموار کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سال دنیا کیلئے کئی معنوں میں ہنگامہ خیز اور صبر آزما تھے۔ مثبت پہلو دیکھے جائے تو صنعتی انقلاب نے پر پھیلا کر ترقی پذیر ممالک میں اپنی جگہ بنالی اور ان ممالک اور تیسری دُنیا کے غریب اور بد حال لوگوں کیلئے امید کی کرن جگادی۔ سائنس کی نئی ایجادات انسانی زندگی کے بقاء کیلئے نئے نئے سامان میسر کر رہی تھیں۔ لیکن اس صدی میں انسان نے عالمِ انسانیت کی تباہی کے سارے سامان بھی تیار کر لئے۔ جن کا کھلم

کھلا مظاہرہ دو عالمی جنگوں میں کیا گیا۔ ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کے حصول کی ایک بے ہنگم دوڑ بھی ان ہی سالوں میں شروع ہوئی اور آج تک پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔

ان سالوں میں ہندوستان کے حالات بھی دگرگوں تھے۔ سیاسی اور سماجی انتشار کی وجہ سے ہندوستان کا قومی وجود ہچکولے کھارہا تھا۔ انگریزوں کے جابرانہ استبداد کے خلاف پورا ملک برسرِ پیکار تھا۔ غریب اور عام لوگ کئی ظلموں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے برطانوی سامراج کے مظالم اپنے عروج پر تھے دوسری طرف سے سرمایہ دار اور جاگیردار خون چوس رہے تھے۔ انتہا پسند اور اعتدال پسند آزادی نوازوں کے درمیان بھی ٹکرتھی۔ مسلمان ہندوستان میں اپنے آپ کو اور اپنی قومی بقاء کو غیر محفوظ تصور کر رہے تھے۔ اس لئے مسلم لیگ ایک نئے ملک کے خواب بن رہی تھی۔ ایسے میں ادیب بھی ان سیاسی اور سماجی حالات سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکے۔ جہاں غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کو اپنے حقوق دلانے کے لئے ترقی پسندی کے نام اشتراکی خیالات ادب اور ادیبوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔ وہی انگریزوں کے ظلم کے خلاف بھی ادیب قلمی جنگ لڑ رہے تھے۔

ریاست جموں و کشمیر کے لئے بھی یہ زمانہ امن و آشتی اور خوشحالی کا زمانہ نہیں تھا۔ پوری ریاست سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور لسانی محاذ پر غیر یقینی صورتحال سے دوچار تھی۔ شخصی راج کا بدترین چہرہ ڈوگرہ شاہی کے روپ میں کشمیریوں کی کمر توڑ رہا تھا۔ لوگ طرح طرح کے مصائب و مشکلات سے دوچار تھے۔ اظہارِ رائے پر قدغن تھی۔ ادیبوں اور تخلیق کاروں کے خیالات پر پہرہ تھا۔ ان ہی صبر شکن حالات میں کشمیر کے عظیم محقق اور دانشور، کشمیری لسانی تحریک کے علمبردار محی الدین حاجتی پیدا ہوئے اور اپنی جوانی کو پنپنے۔ یعنی جب پوری دنیا ایک بھجانی صورتحال اور مشکل حالات سے نکلنے کے لئے راستے تلاش رہی تھی، محی الدین اپنے لڑکپن سے جوانی کے سفر کی اور رواں دواں تھے۔ وہ دنیا کے حالات کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔ ان بدلتے سیاسی اور سماجی حالات کے تناظر میں وہ اپنے تشخص اور پہچان

کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اپنی جوانی میں ہی وہ مشرقی علوم اور فلسفہ کے نباض بن گئے۔ فارسی ادب اور فلسفے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ عربی زبان و ادب کے وہ طالب علم تھے۔ اردو زبان کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ انگریزی اور سائنسی علوم سے بخوبی آشنائی کی۔ ان سبھی امور نے ایک ایسے محی الدین کو جنم دیا جو کشمیر اور کشمیریوں کے تشخص کے متعلق بنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ غور و فکر کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ زبان بھی کسی قوم کے اجتماع شعور کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تمدن کی بھی ضامن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محی الدین حاجتی نے کشمیری تشخص کی بقاء کے لئے کشمیری زبان کی بقاء کو ضروری سمجھا۔

پروفیسر محی الدین حاجتی نے جو سمجھا، اُس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری زندگی کوشاں رہے۔ کشمیریوں کے تشخص کی بحالی اور بازیابی کے لئے انہوں نے کشمیری زبان کو ذریعہ بنایا۔ وہ انفرادی اور اجتماعی، ہر سطح پر سچے اور کھرے کشمیری طرز کے انسان تھے۔ انہوں نے کشمیری لسانی تحریک کی بنیاد رکھی۔ شمالی کشمیر کی ادبی تنظیموں کے وفاق ”ادبی مرکز کمراز“ کو قائم کر کے انہوں نے اپنے وقت میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس وفاق نے ملک اور بیرون ملک رہنے والے کشمیری دانشوروں، مفکروں اور ادیبوں کو جوڑ کر ایک مکمل اور منظم تحریک کی شکل اختیار کی۔ جن شخصیات نے اس ادبی اور تمدنی وفاق کے ساتھ جڑ کر کشمیری لسانی تحریک کو مربوط و منظم کرنے میں محی الدین حاجتی کے شانہ بہ شانہ کام کیا، اُن میں پروفیسر رشید نازکی، علی محمد شہباز، نشاط انصاری، منظور ہاشمی، محمد احسن احسن، محمد امین شکیب، غلام محمد غمگین، سیفی سوپوری، عطیقہ بہن جی وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں۔ یہ تحریک آج بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ منزل مقصود کی اور رواں دواں ہے۔

پروفیسر حاجتی ایک صاحب طرز انشاء پرداز، ایک فکر انگیز قلم کار اور ایک دیدہ ورنش نگار تھے۔ انہوں نے انگریزی میں بھی لکھا اور فارسی کو بھی وسیلہ اظہار بنایا۔ وہ کشمیری میں جس آسانی کے ساتھ قلم اٹھا سکتے تھے اُسی آسانی کے ساتھ اردو میں بھی خامہ فرسائی کرتے تھے۔

البتہ ایک بات طے ہے کہ انہوں نے جس زبان میں بھی لکھا فقط اُن کے پیش نظر کشمیر اور کشمیریوں کی زبانوں کی حالت تھی۔ وہ کشمیری زبان و ادب کو پنپتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے عمر بھر اسی کا زور لگاتے لکھتے بھی رہے اور لڑتے بھی رہے۔ اُن کو کیا کچھ نہیں آتا تھا۔ وعظ و تبلیغ کرنے بیٹھتے تو لوگ اُن کی باتوں پر عیش عیش کرتے۔ فلسفیانہ گھٹیاں سلجھاتے تو افلاطون و سقراط سے آٹھویں دو چار کرتے۔ تنظیم سازی میں اُن کا کوئی ثانی ہی نہ تھا اور فنِ تعمیر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ حقیقت میں ”ہرن مولا“ تھے۔ اُن کے جیسا آج تک کشمیری زبان و ادب کا کوئی ہمدرد پیدا نہ ہوا۔

پروفیسر حاجتی نے اردو میں بہت لکھا۔ لیکن شومی قسمت یہ کہ اُن کے اردو مضامین کو کسی نے بھی آج تک کتابی شکل دینے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرا المیہ یہ ہے کہ یہ مضامین اب دن بہ دن نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ان مضامین کے بارے میں مجھے سب سے پہلے پروفیسر قدوس جاوید نے جانکاری دی، ساتھ ہی مجھے آمادہ کیا کہ میں ان مضامین پر ایک مقالہ لکھوں۔ ان مضامین کو جمع کرنا کا ارادہ تھا۔ لیکن مرحوم احسن صاحب کی ذاتی کوششوں سے میں ان کو جمع کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

پروفیسر حاجتی کے اردو کارناموں پر اپنی رائے اور اپنے تاثرات قلمبند کر کے میں کوئی بہت بڑا علمی، تحقیقی یا تنقیدی کارنامہ انجام دینا نہیں چاہتا ہوں بلکہ میرا خالص مقصد یہ ہے کہ اہل علم و دانش اور ناقدین کی توجہ ان مضامین کی طرف بھی مبذول ہو جائے۔ میری اس طالبِ علمانہ سعی کا واحد مقصد یہی ہے کہ لوگ ان مضامین کو بھی نظرِ التفاف سے دیکھیں اور ان کا معیار مقرر کریں۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا اندازہ ابھی لگانا مشکل ہے۔

اس سعیِ جمیل کے دوران کئی لوگوں نے میری مدد بھی کی اور رہنمائی بھی۔ ان شخصیات کا شکریہ ادا کرنا بہت ہی ضروری سمجھتا ہوں۔

سب سے پہلے پروفیسر قدوس جاوید صاحب کا شکریہ جنہوں نے مجھے اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ اور مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔

استاد محترم ڈاکٹر عزیز حاجتی صاحب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کو چھاپنے کے لئے میری مجھے آمادہ کیا اور اس کتاب کے لئے چند کلمات عنایت فرما کر میرا حوصلہ بھی بڑھایا۔

اپنے دوست ڈاکٹر امین فیاضی کا شکریہ کرنا ضروری ہے، جنہوں نے مجھے اس کتاب کی تیاری کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک مہینہ برداشت بھی کیا اور میری مدد بھی کی۔ میزان پبلیشرز کے مالک شبیر صاحب کا بھی مشکور ہوں، جنہوں نے مجھ پر بھروسہ کر کے اس کتاب کو چھاپا۔

میرے گھر والوں کا شکریہ، جو مجھ سے بہت زیادہ تقاضے نہیں کرتے ہیں۔ آخر پر لیکن سب سے زیادہ دعا اُن کے لئے جواب ہمارے درمیاں نہیں ہے لیکن پھر بھی ہمارے لئے باعثِ حوصلہ و ولولہ ہے۔ جن کا مرقد ہمارے لئے امیدوں اور آستھاؤں کا مرکز ہے۔ جنہوں نے قدم قدم پر میری رہبری فرمائی۔ اللہ محمد احسن کو جو ار رحمت میں جگہ دے۔ وہ نہ ہوتے تو شاید میں طالب علمی کے زمانے میں یہ کام انجام نہیں دے پاتا۔

اب یہ مختصر سی کتاب ہدیہ قارئین کرتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ لوگ اس کو دیکھ کر پروفیسر محی الدین حاجتی کو نئے سرے سے جاننے کی کوشش کریں گے۔ امید ہے کہ اس کی خامیوں کے بارے میں مجھے معاف اور مطلع فرمایا جائے گا۔

والسلام
شا کر شفیع

فصلِ اول

حالاتِ زندگی

پروفیسر محی الدین حاجتی

زندگی کا سفر

کشمیر اپنے قدرتی مناظر کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کے سرسبز و شاداب جنگل، فلک بوس بریلی چوٹیاں، اونچے اونچے پہاڑ، گنگناتے جھرنے، ترنم ریز ندیاں، شیریں چشمے، بلواریں پانی کے جھیل اور ہری بھری وادیاں فطرت کے شیدائیوں کا من موہ لیتی ہیں۔ جو ایک بار یہاں آتا ہے وہ بار بار آنے کی تمنا کرتا ہے۔ کشمیر صرف اپنے فطری حسن کیلئے ہی جانا نہیں جاتا ہے بلکہ یہ وادی گلوبل عرصہ دراز سے علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کے عالموں اور دانشوروں کے افکار نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔

کشمیر زمانہ قدیم سے ہی ایک علمی مرکز رہا ہے۔ بودھ مت اور شیو مت سے وابستہ اسکالر یہاں آکر علمی تشنگی کی تسکین کرتے تھے۔ بڑے بڑے شاعر، عروضی، قواعد کے ماہرین، منطق کے جاننے والے، فلسفی اور ادیب یہاں کے علمی ماحول سے فیضاب ہونے کیلئے دور دور سے یہاں آتے رہے ہیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حاکموں نے اپنے اپنے وقت میں باہر سے آنے والے لوگوں کی ہمیشہ پذیرائی کی ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے سنسکرت عالم کمار جیوانے کشمیر سے چین جا کر چینوں کو علم و آگہی کا پیغام دیا۔ پانچویں صدی سے بارہویں صدی عیسوی تک جو بڑے بڑے شاعر، ادیب اور دانشور کشمیر نے پیدا کئے اُن میں ماتری گپتا (۵۰۰ عیسوی) پراوار، سیدنا دوم، بہماہا، رتناکارا، ادی شنکر، آنند وردھن، ابھنوگپت، مہٹ، بلہن اور کابھن کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کشمیر کی علمی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہندو دھرم

کے ویدک کال میں ۱۸ شکتی پٹیھوں میں سے ایک اہم پیٹھ ”شاردا پیٹھ“ کشمیر میں تھا۔ یہ اپنے زمانے میں علم و آگہی کا بہت بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ جب تک بھارت میں سنسکرت کا چرچہ رہا، کشمیر کی دھرتی سے بھی اس زبان کے بڑے عالم و فاضل پیدا ہوتے رہے۔

بھارت میں سنسکرت کے چراغ کا روغن سوکھنے لگا تو کشمیر میں بھی لسانی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ہندومت اور بودھ مت کی جگہ پر یہاں اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ سنسکرت کی جگہ پر فارسی زبان نے علمی اور ادبی مراکز میں جگہ بنائی۔ کشمیری زبان نے بھی اسی زمانے میں اپنے پنکھ پھیلائے شروع کئے۔ چودھویں صدی عیسوی سے لیکر انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک کشمیر میں فارسی زبان کا غلبہ رہا اور یہ زبان یہاں سرکاری زبان کے درجہ پر فائز رہی۔ کشمیریوں نے اس زبان میں بھی اپنی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دے کر ایران میں اپنی صلاحیت کے جھنڈے گاڑے۔ فارسی کے دور میں یہاں ملا طاہر عینی (غنی کشمیری) اور شیخ یعقوب صرئی جیسے جید عالم پیدا ہوئے۔ غنی کشمیری کی تخلیقات نے برصغیر میں ادیبوں اور عالموں کے ایک بہت بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ جن میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب اور شاعر مشرق علامہ اقبال بھی شامل ہیں۔ شیخ یعقوب صرئی ایک جید عالم اور فلسفی تھے۔ اُن کے افکار کو عالمی سطح پر وقعت اور اہمیت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دوسرے عالموں اور ادیبوں میں بابا داؤد خاکی، حبیب اللہ گنائی، مرزا دراب بیگ، جوا، مرزا اکمل کمال، ملا محمد توفیق، محمد اعظم دیدمری، بیربل کاچرو، تانا براہم ترکی اور حسن شاہ کھڑیہا می کے نام شامل ہیں۔ مغل بادشاہ محمد شاہ کے دور میں محمد اصلاح نے ”تذکرہ فارسی شعرائے کشمیر“ میں ۳۰۳ فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے۔

فارسی کے شانہ بشانہ کشمیر میں کشمیری زبان کو بھی فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اگر فارسی یہاں کی ادبی محفلوں اور درباروں کی زینت تھی تو کشمیری یہاں کے عام لوگوں کی، یہاں کے گلی کوچوں کی اور یہاں کے لین دین کی زبان تھی۔ اس زبان میں ادب کا آغاز حضرت شیخ

العالم اور لیل دید کی عقیدتی شاعری سے ہوا۔ شیخ العالم کے کلام کو لوگ ”کاشتر قرآن“ کے نام سے جانتے ہیں۔ جبکہ لیل دید نے اس زبان میں عرفان و عقیدت کے زمرے گا کر اس زبان کی آن اور شان بڑھادی۔ تب سے لیکر آج تک ہزاروں شاعروں، ادیبوں، عالموں اور دانشوروں نے اس زبان میں علم، عقیدت، عرفان، آگہی، تصوف، تاریخ اور دوسرے علوم کو پیش کر کے اس کو عالمی زبانوں کی صف میں لاکھڑا کیا۔ بدلتے سماجی اور سیاسی دھاروں کے ساتھ کشمیری زبان و ادب بھی اپنا چولا بدلتا رہا۔ جہاں اس زبان میں شمس فقیر، محمود گامی، صد میر، رحمان ڈار، نعمہ صاب اور وہاب کھار جیسے سینکڑوں شعراء نے تصوف اور عقیدت کے نذرانے پیش کئے۔ وہی رسل میر حبہ خاتون اور ان کے قبیل کے دوسرے شعراء نے حسن و عشق کے گیت گا کر اس زبان کو سیلا اظہار بخشا۔ جہاں اس زبان نے ترقی پسند خیالات کو زبان دے کر عبدالاحد آزاد، غلام احمد مجبور، امین کامل، ہنسی نرودش اور اختر محی الدین جیسے کئی ادیبوں کو آسمان پر بٹھادیا تو وہی جدید اور مابعد جدید دور میں رحمان راہی، رشید نازکی، غلام نبی فراق، غلام نبی گوہر، غلام نبی آتش اور ان کے زمانے سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں شاعروں اور ادیبوں کی زبان بن کر انسانی درد و کرب، اندرونی خوف و خلش اور خارجی معاملات و مسائل کے اظہار کا وسیلہ بھی یہی زبان بنی۔۔ اگرچہ یہ زبان یہاں کے سرکاری ایوانوں اور درباروں تک رسائی حاصل نہ کر سکی لیکن یہ ہمیشہ عام لوگوں کے جذبات، احساسات، تجربات، مشاہدات اور خیالات کی ترجمانی کرتی رہی اور آج بھی یہاں کے عوامی حلقوں میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان یہی ہے۔

اُردو زبان ریاست میں دیر سے پہنچی۔ لیکن یہ اس زبان کی مٹھاس اور لطافت ہی ہے کہ بہت جلدی یہ ریاست کے عوام و خواص کو بھاگئی۔ اس زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ بڑی آسانی سے سامنے کی سکت موجود ہے۔ اس لئے یہ زبان بہت جلدی رابطے کی زبان بن جاتی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں بھی رابطے کی سب

سے بڑی زبان اب اردو ہی ہے۔ اُردو یہاں کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کی ہر دل عزیز کی کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ پر تاپ سنگھ نے اس کو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اس سے پہلے ہی ریاست سے اُردو میں پہلا گزٹ ”بدیا بلاس“ شائع ہوا۔ ۱۸۷۲ء میں ہر گوپال خستہ نے اردو میں جموں و کشمیر کی پہلی تاریخ ”گلدستہ کشمیر“ لکھی۔ گلدستہ کشمیر کے شائع ہونے سے پہلے ہی اُردو یہاں پر عام و خاص کی زبان بن چکی تھی۔ کشمیر کے کاروباری اور تاجر لوگ سیاحوں کے ساتھ بات چیت کرنے کیلئے اسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس بات کا اعتراف ہر گوپال خستہ نے ”گلدستہ کشمیر“ میں بھی کیا ہے۔

”گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ اُردو بولتے ہیں اور ہانجیوں وغیرہ طائفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔“

تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جموں و کشمیر میں اردو زبان انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنے پر پوری طرح پھیلا چکی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں ہی اس کی مقبولیت اتنی بڑ چکی تھی کہ اردو عام و خاص کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اسی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۸۵ء میں گلاب سنگھ نے اس کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اب ریاست کا سرکاری کاروبار اُردو زبان میں ہی ہونے لگا۔

ریاست جموں و کشمیر کے مراسم پنجاب کے ساتھ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ایک ہمسایہ ریاست ہونے کے ناطے یہ روا بھی ہے۔ پنجاب کے بڑے بڑے شہر، خاص کر لاہور صدیوں سے شعر و ادب کا مرکز رہے ہیں۔ اردو انیسویں صدی کے اوائل میں ہی پنجاب میں اپنا غلبہ قائم کر چکا تھا اور اس کے شعر و ادب کا ذوق ان شہروں میں خاصا نشوونما پا چکا تھا۔ یہاں پر اُردو صحافت بھی کافی عروج پر تھی۔ ملک میں جو جو ادبی، سیاسی یا صحافتی تحریکیں اٹھی، وہ پنجاب کے راستے ہی ریاست جموں و کشمیر میں وارد ہوئی۔ یہاں تک کہ اُردو زبان و ادب کا

سبیل رواں بھی پنجاب کے راستے سے ہی کشمیر میں داخل ہوا۔

انیسویں صدی کے آخر میں اردو زبان و ادب کے بچنے کا ایک اور بڑا ذریعہ موسیقی تھی۔ پہاڑی سارنگ نواز جو گھوم گھوم کر لوگوں کو موسیقی سناتے تھے تک اردو کی لے اور گانے پہنچ چکے تھے۔ ان کے اردو گانے بہت مقبول ہو رہے تھے۔ ان کے گیتوں اور غزلوں کو سننے کے بعد لوگ اُن کو گنگنائے پھرتے تھے۔ بہت سارے اشعار زبانِ زوِخلاق ہو چکے تھے۔ مثلاً یہ اشعار۔

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائے گا

یار سے ملنا نصیب دشمنان ہو جائے گا

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں

قبر بلبل کی بنے گلزار میں

اردو میں رام لیلہ کھیلنا، بھانڈ جشن دکھانا وغیرہ روایتوں نے زور پکڑا اور اردو ریاست کے ہر حصے میں پھیل گئی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے سے ہی اردو زبان ریاست کے اسکولوں کی تدریسی اور نصابی زبان بن گئی اور میری یادداشت کے مطابق تقریباً ۲۰۰۰ء تک ریاست کی نصابی اور تدریسی زبان اردو ہی تھی۔ رنبیر سنگھ نے اپنے وقت میں ایک محکمہ تراجم بھی قائم کیا تھا۔ اس ادارے نے بہت ساری علمی کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ غرض یہ کہ انیسویں صدی میں اردو ریاست کی زبان بن گئی اور جموں و کشمیر میں رابطہ کے سب سے بڑے وسیلے کے طور پر ابھری۔

بیسویں صدی کے آتے آتے ریاست نے اردو کے بڑے اور نامی گرامی ادیب پیدا کئے تھے۔ پریم ناتھ پردیسی، رام آنند ساگر، پریم ناتھ در۔ ٹھا کر پوٹھی، موہن یادو، خوشی محمد ناظر، محمد الدین فوق، امین بڑھ، اثر صہبائی جیسے قلم کاروں نے اردو کو وہ مستحکم بنیاد فراہم کی،

جس کے دم پر اب کشمیر ہندوستان میں اردو کے ایک بہت بڑے مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں سینکڑوں قلم کاروں نے اردو کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ اردو زبان میں شعر و شاعری کے علاوہ اب تحقیق، تنقید اور تاریخ کا قابل قدر سرمایہ وجود میں آچکا تھا۔ اس صدی کی شروعات میں علی محمد لون، شیخ بہادر بھان، غلام رسول سنوٹش، شکیل الرحمان، عبدالاحد آزاد، عبدالقادر سروری، عرش صہبائی، غلام محمد شوریدہ، شہ زور کشمیری، میر طاووس وغیرہ نے اردو کو بلندیاں عطا کیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں، نور شاہ، حامدی کشمیری، اکبر حیدری، پروفیسر محمد زماں آزرہ، عبدالغنی شیخ لدانی، حکیم منظور وغیرہ نے تحقیق، تنقید، تاریخ اور شعر و ادب کے اعلیٰ نمونے اردو میں پیش کئے۔ صرف اردو کے دلدادہ لوگوں نے ہی نہیں بلکہ کشمیری اور دوسری زبانوں سے محبت کرنے والے لوگوں نے بھی کشمیری اور دوسری علاقائی زبانوں کے کا ز کو آگے بڑھانے کیلئے اردو کا سہارا لیا۔ اردو کا حلقہ اثر دیکھ کر اور اس زبان کی اہمیت کو بھانپ کر کشمیری لسانی تحریک سے وابستہ ادیبوں اور اس زبان کے خیر خواہوں نے کشمیری زبان و ادب کی تاریخ کو اردو میں پیش کیا۔ اس ضمن میں عبدالاحد آزاد کی تصنیف ”کشمیری زبان اور شاعری“ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس روش نے کشمیری لسانی تحریک کے علمبرداروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب یہ زبان صرف ادبی زبان ہی نہیں بلکہ برصغیر ہندو پاک کی سب سے بڑی مذہبی زبان بھی بن چکی تھی۔ خاص کر مسلمانوں نے اپنا مذہبی ادب اسی زبان میں پیش کیا۔ اب اس زبان سے لگاؤ ناگزیر تھا۔ اردو کی بڑھتی اہمیت دیکھ کر وہ لوگ بھی اس زبان کو وسیلہ اظہار بنانے کیلئے مجبور ہو گئے جن کا جینا مرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جا گنا فقط کشمیری زبان، ادب، ثقافت اور قوم کیلئے تھا۔ ایسی ہی شخصیات میں ایک قد آور اور بہت بڑا نام ”پروفیسر محی الدین حاجتی“ ہے۔

پرفیسر محی الدین حاجتی اصل میں عربی کے عالم تھے لیکن انہوں نے اپنی پوری زندگی کشمیری زبان و ادب کو ترقی و ترویج دینے میں صرف کی۔ وہ ایک جید عالم ہونے کے ساتھ ایک ہمہ جہت تحریکی علمبردار تھے۔ اپنے وقت کے منطقی، سائنسی، مذہبی اور معاشرتی علوم کے باریک بین عالم ہونے کے باوجود بھی وہ کشمیری زبان و ادب سے لپٹے رہے۔ انہوں نے عربی میں بھی لکھا، انگریزی میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور اردو زبان کو بھی ذریعہ اظہار بنایا۔ لیکن جس بھی زبان میں لکھا، صرف اور صرف کشمیری کیلئے لکھا۔ کیونکہ انہیں کشمیر، کشمیری اور کشمیریوں سے بے پناہ محبت تھی۔

پروفیسر حاجتی ”حاجن“ کے رہنے والے تھے۔ حاجن سرینگر سے تقریباً ۳۰ کلومیٹر دور شمال میں دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر واقع ایک قصبہ ہے۔ حاجن پوری ریاست میں کئی وجوہات کی بناء پر اپنا ایک نام اور مقام رکھتا ہے۔ اس علاقے میں بڑے بڑے دانشور، ادیب اور کشمیری لسانی تحریک کے علمبردار پیدا ہوئے ہیں۔ کشمیری زبان کے سب سے بڑے بسیار گوشاعر ”عبدالوہاب پرے حاجتی“ اسی زمین کی پیداوار ہے۔ وہاب پرے حاجتی کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ”فردوسی“ کی شہرہ آفاق تصنیف ”شاہنامہ“ کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ اسی بنیاد پر انہیں ”فردوسی کشمیر“ کے لقب سے جانا جاتا ہے۔ کشمیری زبان کے سب سے بڑے مذہبی شاعر ”مولوی صدیق اللہ“ بھی حاجن میں ہی پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ اُن کی لکھی ہوئی ”بدائع منظوم“ اور ”شکل و شامل آنحضرت“ کشمیری ادب میں ایک الگ باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسد پرے جیسے مبہم صوفی شاعر کا مسکن بھی حاجن ہی رہا ہے۔ شریف انفس مگر پر عزم لسانی اور تنظیمی کارکن، ادبی رضا کار اور کشمیری زبان کے بہت بڑے خیر خواہ محمد احسن بھی اسی گلستان کا گلاب ہے۔ آج کے دور میں کشمیری لسانی تحریک کے علمبردار ڈاکٹر عزیز حاجتی نے بھی اسی زمین پر جنم لیا ہے۔ ادبی اور لسانی سرگرمیوں کیلئے یہ زمین بہت زرخیز اور مردم خیز رہی ہے۔ ریاست کی بہت پرانی ادبی تنظیم

حلقہ ادب سونارواری کی بنیاد یہاں ہی پڑی اور پچھلے ساٹھ سالوں سے یہ تنظیم کشمیری زبان و ادب کی آبیاری کرنے میں کوئی بھی دقیقہ فرغ و گذاشت نہیں کر رہی ہے۔ شمالی ہندوستان کی گراں قدر لسانی تنظیم اور تحریک ”ادبی مرکز کمراز“ کے قیام کے پیچھے بھی حاجن ہی ایک محرک رہا ہے۔ حاجن ایک ادبی چشمہ ہے۔ اس چشمہ نے وادی کے ادبی اور لسانی بنجر کو زرخیز بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کئی تشنگان ادب اپنی پیاس بجھانے کیلئے آج بھی اس چشمے سے رجوع کرتے ہیں۔ حاجن کی اسی ادبی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے وادی کے نامور محقق اور مورخ جناب محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں۔

”حاجن کو کشمیر میں وہی مقام حاصل ہے جو مقام بدایوں کو اتر پردیش میں حاصل ہے۔“

ملک کے نامی اور گراں قدر ادیب، نقاد اور محقق پروفیسر محمد زماں آزر دہ کو حاجن کے ساتھ بے پناہ انس ہے۔ حاجن کی ادب نوازی کا اعتراف انہوں نے ایک مجلس میں (جس میں بذاتِ خود میں بھی موجود تھا) یہ کہہ کر کیا ہے۔

”حاجن کو کشمیری زبان و ادب کیلئے وہی مقام حاصل ہے جو مقام اردو کیلئے لکھنؤ کو حاصل ہے۔ یہاں اگر کوئی شخص گھپ بھی ہانکتا ہے تو وہ شعر ہوتا ہے۔“

اب اس علاقہ کی اہمیت اور افادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ یہ قصبہ پوری وادی

۱۔ پیش لفظ ”کلیاتِ اسد پرے“ مطبوعہ ریاستی کلچرل اکادمی

۲۔ یوم الطاف نیاز کے موقع پر حاجن ہائر اسکول میں کہا

میں اپنی زرعی پیداوار، پشوپال اور باغبانی کے لئے بھی مشہور ہے۔ لیکن اس کی علمی، ثقافتی اور ادبی پہچان ہی اصل میں اس کا خاصہ ہے۔ اس پہچان کو برقرار رکھنے کیلئے ہمارے اکابرین نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ اپنے اسلاف کی روشن کی ہوئی مشعل کو فروزاں رکھنے کیلئے یہاں کے نوجوان ادیب اور لسانی رضا کار اُن کے نقش قدم پر چل کر بحسن و خوبی اپنا حاجتی ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔

ہاں۔ آج سے تقریباً ۹۱ سال پہلے اسی تمدن ساز اور ادب نواز قصبہ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ایسا پھول کھلا کہ اُس نے اپنی مہک سے گرد و نواح کے ماحول کو معطر کر دیا۔ جہلم کے پانی کو مشکبار بنا دیا۔ اس پھول نے قدیم اور جدید رنگ و بو کو سمیٹ کر ایک ایسی انفرادیت قائم کر لی کہ اسکی انفرادیت ہی اسکی پہچان بن گئی۔ اسی علامتی پہچان کا نام ”محی الدین حاجتی“ ہے۔ جو تمام عام و خواص، پار و احباب، چھوٹے بڑوں اور اپنے پرائیوں میں پروفیسر حاجتی کے نام سے جانے جاتے تھے اور اسی نام سے وادی کے مرد و زن اُن کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

پروفیسر حاجتی کے اجداد حاجن کے پرے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا پیشہ زمینداری تھا۔ حاجتی صاحب کا خاندانی پس منظر دیکھا جائے تو ہمیں کہیں بھی کوئی شاعر یا ادیب نظر نہیں آتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حاجتی صاحب کو علم و آگہی وراثت میں نہیں ملی تھی۔ حاجتی صاحب کے والد کا نام ”نیر پرے“^۱ تھا اور دادا کا نام حاجی عبدالرحمان پرے۔ ماں کا نام ”اشہ بیگم“ تھا۔ جو حاجن کے پرے خاندان کی ہی بیٹی تھی۔

مقامی معلومات اور سرکاری ریکارڈ کے مطابق حاجتی صاحب ۲۲ جون ۱۹۱۷ء کو حاجن کے پرہ محلہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن اوتار کرشن رہبر اور غلام نبی خیال اس کے برعکس اُن کا یوم

۱۔ غلام نبی پرے کو عرف عام میں نیر پرے کہتے تھے۔

۲۔ ”پروفیسر حاجتی“ از عزیز حاجتی مطبوعہ ”باز یافت“ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

پیدائش ۲۱ جون ۱۹۱۷ء بتاتے ہیں۔ حاجی صاحب نے خود بھی اسی تاریخ کی تصدیق کی ہے۔^۱

محی الدین ابھی زندگی کی پہلی بہار ہی دیکھ رہے تھے کہ اُن کے والد اپنے فرزند کا بہار دیکھے بغیر ہی اس دُنیا سے فانی سے رحلت کر گئے۔ چونکہ اس زمانے میں لوگوں میں سادگی اور خوفِ خدا بہت زیادہ تھا۔ اس لئے یتیم محی الدین کی پرورش اُس کے رشتہ داروں نے بہت ہی لاڈ پیار سے کی۔ اگر پیارے نبی کے سر مبارک سے والد محترم حضرت عبداللہ کا سایہ اٹھا۔ لیکن اللہ کو منظور یہ تھا کہ آپ ﷺ کی پرورش آپ ﷺ کے شفیق چچا حضرت ابو طالب کو نصیب فرمائی۔ محی الدین بھی اس معاملے میں کافی خوش نصیب رہے۔ باپ کا سایہ اللہ نے سر سے اٹھایا تو ان کی پرورش بھی اُن کے شفیق چچا لسی پرے کے نصیب میں لکھی تھی۔ جنہوں نے ان کی پرورش میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ لسی پرے پٹیشے سے مستقل زمیندار اور جزوی طور پر تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست پُر مغز اور ہوشیار انسان تھے۔ اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طبیعتاً حساس اور خدا پرست ہونے کے ساتھ ساتھ اولیاء کے زبردست معتقد تھے۔ انہوں نے محی الدین کی پرورش بالکل مذہبی طور طریقوں سے کی اور جوں ہی محی الدین نے حوش سنبھالا اُن کو رواج کے مطابق حاجن کے پرائمری اسکول میں درج کیا۔ ایڈمیشن ریکارڈ کے مطابق انہیں ایڈمیشن نمبر ۱۵۰ (ایک سو پچاس) کے تحت ۱۱ جون ۱۹۲۳ء کو درج کیا گیا۔ اُس وقت حاجی صاحب کی عمر پانچ سال گیارہ مہینے اور نو دن تھی۔^۲

چونکہ اُن دنوں حاجن ایک پسماندہ گاؤں تھا۔ جہاں لوگوں کا گذرہ عام طور سے کھیتی باڑی پر ہی ہوتا تھا۔ صنعتی اور سائنسی انقلاب کے بارے میں یہاں کے لوگ اُن دنوں اتنا ہی

۱ ”کوشنر“ از بہرہ و خیال مطبوعہ کلچرل اکادمی

۲ ”کاشر شامیری“ مطبوعہ سہیتہ اکادمی ۱۹۶۰ء

۳ ”پروفیسر حاجی حالاتِ زندگی“ از ڈاکٹر عزیز حاجی مطبوعہ ”شیراز“ کلچرل اکادمی

جانتے تھے۔ جتنا ایک پسماندہ علاقے کے لوگ جان سکتے ہیں۔ اس لئے تعلیم کا مطلب اُن لوگوں کے نزدیک فارسی اور عربی کے ایک دو قاعدے پڑھنے سے زیادہ نہ تھا۔ حالانکہ حاجن میں پروفیسر محی الدین حاجتی سے پہلے بھی بڑے شاعر پیدا ہوئے تھے۔ جن میں مولوی صدیق اللہ، وہاب حاجتی، رمضان ڈار، اسد پرے وغیرہ قابل قدر ہیں۔ لیکن حاجتی صاحب کی شخصیت ایک ہمہ جہت شخصیت تھی، حاجن میں علم و آگہی کا سب سے بڑا مرکز وہی پرائمری اسکول تھا۔ جس میں محی الدین کو داخل کیا گیا۔ محی الدین نے اسی اسکول سے پرائمری درجہ (پانچویں) کا امتحان پاس کیا۔ اب مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے حاجتی کو یا تو سوپور جانا تھا، یا پھر سرینگر۔

چونکہ اُن دنوں ٹرانسپورٹ کی سہولیات صرف گھوڑے اور کشتی کی صورت میں دستیاب تھی۔ اسلئے سرینگر جانے سے آسان سوپور جانا تھا۔ سوپور کا راستہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ حاجن والوں کا وہاں رشتہ داری اور دیگر معاملات زندگی کے سلسلے میں آنا جانا لگ رہتا تھا۔ اسلئے محی الدین کے سامنے ہر صورت میں سوپور کی ہی صورت تھی لیکن یتیم، کم عمر اور گھروالوں کا چہیتہ ہونے کی وجہ سے گھر والے انہیں سوپور بھیجنے کیلئے تیار نہ ہو سکے۔ اسلئے ڈھائی سال تک اُن کو گھر میں ہی رکھا گیا۔ آخر کار ۱۹۳۱ء میں کچھ لوگوں کے اصرار کے بعد حاجتی کو سوپور کے ہائی اسکول میں جماعت ششم میں داخل کر دیا گیا۔ سوپور کے حاتی شاہ محلہ میں حاجی عبدالغفار کیمہ کے گھر میں اُن کے رہنے کا انتظام کیا گیا۔ اسکے علاوہ ۱۹۳۲ء میں تاروز سوپور میں بھی کچھ وقت کیلئے قیام کیا۔

یہ زمانہ شخصی راج کا زمانہ تھا۔ ورمل، سوپور اور کپوارہ، ان تین قصبوں میں صرف ایک سرکاری ہائی اسکول تھا اور وہ سوپور میں تھا۔ ورمل ضلع صدر مقام ہونے کے باوجود بھی وہاں پر کوئی بھی سرکاری ہائی اسکول نہیں تھا۔ البتہ وہاں پر دو غیر سرکاری ہائی اسکول، سینٹ جوزف اور نیشنل ہائی اسکول تھے۔ سوپور کے سرکاری ہائی اسکول میں محی الدین نے ۱۹۳۶ء میں

دسویں (Matric) کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ اور مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے حاجن کے فرزند کو سرینگر کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ جہاں پر انہوں نے سری پرتاب (S.P. College) کالج میں داخلہ لیا۔ اسی کالج سے انہوں نے ۱۹۴۰ء میں اعزاز کے ساتھ بی۔ اے۔ آنرز (B.A. Honours) کی ڈگری حاصل کی۔ سرینگر میں نواکدل کے غلام رسول کنڈجی کے گھر میں اُن کا ڈیرہ تھا۔^۱

جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ حاجن ایک پسماندہ گاؤں تھا۔ لیکن ادیب پیدا کرنا اس کی مٹی کی خصوصیت رہی ہے۔ اسی وجہ سے حاجن کو کشمیر میں وہی اہمیت حاصل ہے۔ جو اہمیت قصبہ ”بدایوں“ کو اتر پردیش میں حاصل ہے۔ محی الدین حاجنی سے پہلے بھی مذہبی عالم اور ادیب حاجن میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ان شخصیات نے کشمیری زبان و ادب کی آبیاری اپنے اپنے مقدور کے مطابق کی۔ یہ تمام حضرات عقیدتاً یکے مسلمان تھے۔ چونکہ حاجن میں سخت مذہبی ماحول تھا اسلئے وہاں پر دینی اور عربی تعلیم کو ہی مقدم سمجھا جاتا تھا۔ ”محی الدین بھی ایک عالم دین بن کر پورے علاقے کو دین کی روشنی سے منور کر دے۔“ یہی آرزو محی الدین کے بچپن سے ہی اُن کے شفیق چچا لسی پرے کے دل میں پنپ رہی تھی اور اب وہ وقت آیا جب حاجنی اپنے پالنہار کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکتے تھے اور اسی مقصد کیلئے ۱۹۴۰ء میں مالی مشکلات کے باوجود ہمدرد لسی پرے نے محی الدین کو مزید تعلیم واگہی کیلئے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے۔ عربی کورس (Course) کیلئے اُن کا ایڈمیشن ہوا۔ لیکن حاجنی صرف ماسٹر آف آرٹس بن کر حاجن واپس نہیں آئے۔ بلکہ وہ وکالت کی ڈگری (L.L.B.) اور صحافت میں ڈپلوما (Diploma in Journalism) کی اسناد بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ اس سے بڑھ کر حاجنی کی ذہانت،

۱ بحوالہ ”شیراز“ کلچرل اکادمی

۲ محی الدین حاجنی ”ہندوستانی ادب کو معمار“ از نشاط انصاری

قابلیت اور محنت کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے، کہ جہاں عام طالب علم ایک ڈگری صد صدقے و نیاز کی بدولت حاصل کرتے تھے۔ وہاں حاجن کے محی الدین نے اپنی محنت اور ذہانت سے تین ڈگریاں ایک ہی وقت میں امتیازات کے ساتھ حاصل کر لیں۔ اس کے علاوہ وہ یونیورسٹی کے لیٹن کتاب خانے کے مخطوطات شعبہ میں جا کر تحقیقی مطالعے میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ اسی کتب خانہ سے انہوں نے ”کتاب الطواصین“ کا ترجمہ اور تفسیر لکھنی بھی شروع کی۔^۱

انگریزی کی مشہور کہاوت ہے کہ۔

"Some are born great, Some achieve greatness and greatness is thrust upon some."

جہاں تک پروفیسر محی الدین حاجنی کا تعلق ہے۔ اُن کے بارے میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ۔

"He achieved greatness by his intellectual ability and hardwork".

حاجنی صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کا انتہائی شوق تھا۔ علی گڑھ بھی اسی وجہ سے بھیجے گئے تھے۔ اُن کے شوق و ذوق کا حال یہ تھا کہ ایک دن وہ پڑھنے کی فکر میں ہوٹل سے پا جاے کے بغیر ہی نکلتے ہوئے دیکھے گئے۔ اس واقعہ کے متعلق غلام نبی گوہر نے خواجہ مبارک شاہ کا حوالہ دیکر کہا ہے کہ۔

”ایک دن ہم بیٹھے ہوئے تھے اور شاہ صاحب نے پروفیسر حاجنی سے کہا:۔“ تم ایم۔ اے۔ کلاس سے فارغ ہو کر آئیے تھے۔ اور جرنلزم کے اُستاد سے بھی نوٹس لے چکے تھے۔ اور شاید لائبریری میں بھی کچھ ذہن کھپا کر آئے ہوئے تھے۔ کمرے میں کتابیں بدلنی تھیں اور شاید کپڑے بھی بدلنے تھے۔ اتنے میں شعبہ قانون سے گھٹنا بجا۔ تو آپ

^۱ ”اقبال اور طراح“ از پروفیسر حاجنی از پروفیسر حاجنی ”محفل اقبال“ ہجرل اکادمی ۱۹۷۷ء

دوڑ کر باہر آئے۔ ہم لان میں منتظر تھے۔ اور جونہی یہ صاحب کمرے سے باہر نکلے ہم انہیں دیکھ کر قہقہہ ضبط نہ کر پائے۔ اس کو کمرے میں واپس جانے کیلئے اصرار کرتے رہے مگر وہ ایک نہ سن پائے۔ تو ہم نے انکو جبراً کمرے میں واپس لے کر یہ دکھایا کہ وہ سر پر ٹوپی بھی پہنے ہوئے تھے۔ شیروانی کے بٹن بھی بند تھے۔ بوٹ کے تسمے بھی چڑھائے تھے۔ مگر ٹانگیں ننگی۔ یہ حال دیکھ کر کوئی تاثر نہ دیا۔ بس پا جامہ پہن کر کلاس کو چل دیئے۔^۱

عصر حاضر میں جب کہیں والدین اپنی اولاد کو اونچی تعلیم دینے کا قصد کر لیتے ہیں۔ تو سب سے پہلے ایک بات کی گانٹھ باندھتے ہیں کہ جب تک نہ اُن کی اولاد اپنی تعلیم مکمل کر کے نوکری حاصل کرے۔ تب تک اُن کی شادی نہیں ہوگی۔ چونکہ حاجنی ایک گاؤں کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہو کر پلے بڑے تھے۔ اسلئے اُن کے ساتھ اس کے برعکس ہوا۔ گاؤں کے رسم و رواج کے مطابق شادیاں چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہیں۔ اور آج حاجن ایک ٹاؤن (Town) ہونے کے باوجود بھی ماں باپ اس فرض کو عام طور پر غلت میں ہی انجام دیتے ہیں۔ چونکہ محی الدین حاجنی یتیم تھے۔ شاید اسی لئے، کسی حق ادا کی سبب یا فرض کو انجام دینے کی غرض سے اور پھر سب سے بڑ کر لاڈ و پیار کی وجہ سے اُن کے معاملے میں زیادہ ہی غلت سے کام لیا گیا۔ اُن کی شادی اُس وقت ہوئی۔ جب انہوں نے سو پور کے سرکاری ہائی اسکول کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ سرینگر کے ایس۔ پی۔ کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تو دور کی بات ہے۔ شادی کے وقت حاجنی صاحب حاجن کے واحد تعلیمی ادارے پر انٹرمی اسکول حاجن میں ہی اپنے بچپن کے دن گزار رہے تھے اور تیسری جماعت میں ہی پڑھتے تھے۔^۲

۱ "حاجنی ایک متحرک دارالعارف" از غلام نبی گوہر مطبوعہ "باز یافت" شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

اُن کی بیوی کا نام ”سروہ“ تھا۔ وہ ایک اُن پڑھ اور سیدھی سادھی گھریلو عورت تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ حاجتی صاحب کے عالمانہ مزاج کی قدر شناس اور قدردان تھی۔ صغریٰ میں شادی کے باوجود بھی حاجتی صاحب اپنی پڑھائی کے شوق میں مست رہے۔ اس عمر میں شادی کے بعد اُنکے حصول تعلیم کے معاملے اور باقی معاملاتِ زندگی پر کوئی منفی اثر نہ پڑا اُن کی خود اعتمادی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ ورنہ اس عمر کی شادیاں اکثر ناکام ہو کر طرفین کیلئے وبال جان بن جاتی ہیں۔ حاجتی صاحب کی شادی ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ جب اُن کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس بارے میں عزیز حاجتی کہتے ہیں۔

”اُنکی شادی صغریٰ یعنی دس برس کی عمر میں کی گئی۔“^۱

جبکہ ملک راج صراف اُنکی عمر شادی کے وقت تیرہ سال لکھتے ہیں۔ اس طرح عزیز حاجتی اور ملک راج صراف کے بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ لیکن جب میں نے کچھ بزرگوں اور حاجتی صاحب کے رشتہ داروں سے اس بارے میں بات کی۔ تو انہوں نے ڈاکٹر عزیز حاجتی کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ”محی الدین تیسری یا چوتھی جماعت میں شادی کے وقت پڑھتا تھا۔“ میرے دادا جی بھی حاجتی صاحب کے ہم جماعت تھے۔ انہوں نے بھی ایک دن مجھ سے یہی کہا تھا۔ کہ ”میں نے صرف تیسری جماعت تک پڑھا ہے۔ محی الدین میرے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ جس سال میں نے اسکول چھوڑ دیا تقریباً اُسی سال محی الدین کی شادی ہو گئی۔“

چاہئے دس سال ہو یا تیرہ سال حقیقت یہ ہے کہ حاجتی صاحب کی شادی بہت ہی کم سنی میں ہوئی اور اس کے باوجود انہوں نے جو مقام حاصل کیا وہ اُن کی لگن کا محنت کا پتہ دیتا ہے۔

۱۔ ”پروفیسر محی الدین حاجتی“ از ڈاکٹر عزیز حاجتی مطبوعہ ”باز یافت“ شعبہ اردو کشمیر

یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

سورج کو تخلیق اسی لئے کیا گیا ہے کہ وہ پورے عالم کو منور کر دے۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً بڑے بڑے اولو العزم اور جلیل القدر انسان بھی ظلمت کے اندھیروں کو مٹانے کیلئے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر حاجتی بھی انہی جلیل القدر لوگوں میں سے تھے جو قوم کی فلاح و بہبود کیلئے ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں۔ سو پورہائی اسکول میں پڑھنے کے دوران ہی حاجتی صاحب کی زندگی کی مختلف جہتیں سامنے آنی لگیں تھیں۔ کلاس میں اپنی قابلیت سے انفرادیت قائم کرنے کے علاوہ انہوں نے کچھ ملی، سیاسی اور صحافتی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مظلوم کشمیری شخصی راج کے ظلم کے خلاف منظم ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلم کانفرنس کی بنیاد کے ساتھ تحریک حریت بھی شروع ہو چکی تھی۔ مسلم کانفرنس کے کارکن آگے لے جانے کیلئے نوجوان طالب علموں کی ایک جماعت ”مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن“ وجود میں آچکی تھی۔ حاجتی صاحب اس تنظیم کے جنرل سیکریٹری جبکہ غلام نبی نمندہ گرو اس کے صدر تھے۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام ۱۹۳۳ء میں شخصی حکمرانی کے خلاف ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ حاجتی صاحب اس جلوس کے ہر اول دستے میں شامل تھے۔ جلوس پر پولیس نے دھاوا بول دیا اور لاٹھی چارج کیا۔ بہت سارے طالب علم گرفتار کئے گئے۔ گرفتار کئے گئے طالب علموں میں حاجتی صاحب بھی تھے۔ ان تمام طالب علموں سے پوچھ تاچھ کی گئی اور برما آرڈیننس (Burma Ordinance) کے تحت انہیں سزا دی گئی۔ اس طرح حاجتی صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

۱۹۴۲ء میں حاجتی صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ عربی اور ایل۔ ایل۔ بی پاس کر کے مقامی طور پر ایک عجبہ قائم کیا۔ ایم۔ اے۔ کارزلٹ (Result) آنے کے ساتھ ہی وہ ۱۹۴۲ء میں جموں کے ”پرنس آف ویلز کالج“ میں بحیثیت لیکچرار تعینات ہوئے۔ جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ حاجتی صاحب نے ایل۔ ایل۔ بی۔

۱۔ ”محی الدین حاجتی منزلیہ پٹھہ مزارس نام“ از ذاکر عزیز حاجتی ”دولہ کو ملر“ حلقہ ادب سوناواری

کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔ یعنی وہ وکالت کا پیشہ اختیار کر کے اپنی ذہانت سے اس پیشے میں نام کمانے کے علاوہ بہت سارا پیسہ بھی کما سکتے تھے۔ لیکن ایک پکے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ حاجتی ایک بے لوث اور صاف دل انسان بھی تھے۔ اسلئے اُن کی طبیعت نے وکالت کا پیشہ اختیار کر کے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا گوارا نہیں کیا اور حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ نے انہیں ایک معلم کے طور ہی پیدا کیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے پیغمبروں کا پیشہ اختیار کر کے مدرس کا کام انجام دیا۔

جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں حاجتی صاحب سات سال رہے اور اسکے بعد اُن کا تبادلہ سری پرتاب کالج سرینگر میں ہوا۔ یہاں وہ ترقی کرتے ہوئے پہلے ریڈر اور پھر پروفیسر بنے۔ اس کالج میں حاجتی صاحب کے ادبی ذوق میں نکھار آیا۔ یہاں پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ مباحثوں اور سیمیناروں وغیرہ کا اہتمام بھی کرتے رہے۔ وہ کافی عرصہ تک پرتاب میگزین کے کشمیری سیکشن کے ایڈیٹر اور میگزین کے کنوینر رہے۔ اس کالج کے آفیشل آرگن Discourses میں ان کے کئی انگریزی مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین کے مطالعے سے حاجتی صاحب کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ آخر کار وہ ۱۹۷۲ء میں اسی کالج سے سبکدوش ہوئے۔^۱

حاجتی صاحب عملی طور پر کوئی سیاستدان نہیں تھے۔ لیکن یہاں کی سیاست کے متعلق وہ اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ اپنے سیاسی نقطہ نظر کو انہوں نے کبھی بھی مصلحت یا مجبوری کی نظر نہیں کیا۔ چونکہ حاجتی صاحب انتہائی درجہ کے خوددار، دلیر اور صاف گو انسان تھے اس لئے وہ خوف اور ڈر کے اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کا اظہار تحریری اور تقریری دونوں صورتوں میں کرتے رہے۔ یہاں کے سیاستدانوں اور ارباب اقتدار کے خلاف وہ ہمیشہ طنز

۱۔ محی الدین حاجتی ”ہندوستان اور کونو معمار“ از نشاط انصاری ساہتیہ اکادمی

آميز لہجہ اختیار کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے انہیں اکثر دھمکیاں نصیب ہوتی تھیں۔ لیکن حاجی نے کبھی بھی اپنے انفرادی اظہار سے کنارہ نہیں کیا۔ نتیجتاً انہیں دوبار جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہ پہلی بار ۱۹۳۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں نظر بند کئے گئے۔ ۱۹۶۵ء کی نظر بندی کے دوران انہوں نے ”مقالات“ نام کی وہ اہم نثری کتاب لکھی۔ جس کے لئے انہیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مقالات کشمیری نثر کی بہترین کتاب ہے۔ دوسری نظر بندی کے دوران ہی ان کی شفیق بہن سعیدہ بیگم اور پھر ۱۹۶۶ء میں اُن کی ماں اشہ بیگم انتقال کر گئیں۔ ماں کے انتقال کے تقریباً چھ (۶) سال بعد ۱۹۷۲ء میں اپنی نیک بیوی کی رفاقت سے بھی محروم ہو گئے۔

حاجی صاحب کے باغیرت، خوددار اور صاف گو ہونے کی سب سے اہم وجہ اُن کا خدا پرست اور دیندار ہونا تھا۔ وہ صوم و صلوات کے سخت پابند تھے اور ہمیشہ پنجگانہ نماز پڑھتے تھے۔ روزہ مکمل طور پر شریعت کے لحاظ سے رکھتے تھے اور باقی اسلامی عقائد کی پیروی بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں سفر محمود پر جا کر حج بیت اللہ کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اُن کے ساتھ اُن کی بڑی اور فرمانبردار بیٹی حلیمہ بھی تھیں۔

اولوالعزم لوگ ہمیشہ موت کو ایک نئی زندگی کی ابتدا سمجھ کر زندگی اور موت کو لازم ملزوم سمجھتے ہیں، اسلئے وہ ہمیشہ زندگی کے قیمتی لمحات کی قدر کرتے ہوئے انہیں ضائع نہیں کرتے۔ حاجی بھی ایک برگزیدہ انسان تھے، اسلئے وہ چاہیے آنکھوں کے مرض میں مبتلا رہے یا کسی اور بیماری میں، موت سے نہ ڈرتے ہوئے وہ ہمیشہ زندگی کے قیمتی لمحات میں کچھ کرنے کی سعی کرتے رہے اور اپنی بیماری سے بے فکر ہو کر وہ تحقیق و تخلیق کے کاموں کے علاوہ دوسرے تنظیمی امور میں مشغول رہے۔ اسی لئے بہت سارے امراض اُن کو دامن گیر ہو گئے۔ لیکن اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ اوروں کیلئے زندگی کے راستے آسان کرتے گئے۔ دل کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ ایسے کہ انہیں دلی لے جانا پڑا۔ لیکن بے خبری کے عالم میں۔ انہیں پتہ چلتا تو شاید بیماری کی حالت میں ہی بھاگ کر آتے۔ آخر کار جب پتہ چلا۔ تو غصے

سے بے قابو ہو کر احسن صاحب پر برس پڑے اور کہا۔

”آپ لوگ موت سے کیوں لڑ رہے ہو میں اس وقت تریسٹھ سال کا ہوں۔ فخر کائنات آنحضورؐ کی بھی یہی عمر تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری کم عقلی کی وجہ سے میں وہاں پہنچا۔ جہاں کی مجھے بچپن سے ہی نفرت ہے۔“ (ترجمہ)

اگرچہ دہلی کے کے۔ سی۔ ہسپتال میں حاجتی صاحب کے ساتھ موجود تیار دار اُن کی اس شدت پسندی کو جہالت سمجھتے تھے۔ لیکن حقیقت میں اُن کی اس کوشش سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اگرچہ اس واقعے کے بعد حاجتی صاحب تیرہ سال تک زندہ رہے۔ لیکن وہ محض ایک زندہ لاش بن کر رہے۔ کیونکہ اسکے بعد نہ ہی حاجتی کچھ لکھ سکے، نہ چل سکے اور نہ ہی کچھ پڑھ سکے۔

پروفیسر محی الدین کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ مذہبی معاملات میں زبردست دلچسپی لیتے تھے۔ معاملہ چاہے مذہبی مباحث کا ہو یا پھر کسی مذہبی غلط فہمی کا۔ وہ انسان کو منطقی دلیلوں اور قرآن و احادیث کے حوالوں (References) سے مطمئن کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مذہبی عبادت گاہوں کی تعمیر میں بھی زبردست دلچسپی لیتے تھے۔ جس کی ایک زندہ مثال حاجن کی جامع مسجد ہے۔ جس کو انہوں نے اپنے گھر کے باہر ہی تعمیر کیا۔ حاجتی صاحب علالت سے پہلے لگاتار اس مسجد میں جمعہ کے دن خطبہ دیتے اور امامت بھی کرتے تھے۔ نماز کے فوراً بعد وہ مسجد کے لان میں ایک بورڈ لگاتے اور وہاں پر لوگوں کے مذہبی اور دیگر سوالات سنتے اور پھر لوگوں کو اُن کے سوالات کے جوابات دیتے۔ وہ حاجن کی اوقاف کمیٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اس کے علاوہ چند اعلیٰ پایہ کے اسلامی اداروں کے ساتھ بھی

۱۔ ”پروفیسر حاجتی منزلیہ پٹیل مزارس تام“ از عزیز حاجتی، مطبوعہ، دہلی کی حاجتی نمبر (حلقہ ادب و سوانحاری)

وابستہ رہے۔ ان اداروں میں رابطہ عالم اسلامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس کے حاجتی صاحب ممبر تھے۔

ذاتی طور طریقوں سے حاجتی صاحب ہمیشہ سادگی پسند رہے۔ ان کے لباس میں ایک لمبا چکن، سفید پانچامہ، قراٹھی ٹوپی، چمڑی (Leather) جو تا شامل ہوتا تھا۔ مشاغل میں وہ تاش کھیلنا اور آتش بازی کا تماشا دیکھنا پسند کرتے تھے۔^۱

محی الدین حاجتی قدیم و جدید خصوصیات کا ایک امتزاج تھے۔ اُن کی علمی سوچ مغربی طرز کی تھی۔ لیکن دل پر مشرقیت کی ایک چھاپ تھی۔ حالانکہ اونچی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ مغربیت کے دلدادہ نہیں بنے۔ اُن کے رہن سہن اور دیگر معاملات زندگی میں جہاں مذہب کا زبردست اثر تھا۔ وہی اُس پر مشرقیت بھی چھائی ہوئی تھی۔ فیشن پرستی سے حاجتی اس حد تک بے نیاز تھے کہ انہوں نے کبھی کلائی پر گھڑی نہیں باندھی۔ نہ کبھی اپنی زندگی میں نیکھائی کا استعمال کیا۔ بلکہ کبھی کبھار اپنے اُن دوستوں، جو نیکھائی پہنتے تھے، پر زبردست طنز کے تیر چلاتے۔ اس بارے میں آئینہ کے مدیر^۲ اُن کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”حاجتی صاحب ہمارے پروفیسروں کی بالشتہ قد نسل میں دیوزاد نظر آتے ہیں۔ وہ نیکھائی اور کتابی چہرے کی سند لے کر کلاس میں نہیں جاتے۔ بلکہ نقد علم و حکمت لے کر وہ عربی کے پروفیسر ہیں۔ لیکن سائنس، آرٹ، اور نفسیات پر اُن کی نظر گہری ہے۔ وہ اپنی ظاہری شکل و شبہات سے بے پروا ہیں۔ مگر اس میں قلندری کی شان بے نیازی ہے۔“^۲

۱۔ ”پروفیسر حاجتی منزلیہ ٹیچہ مزار اس نام“ از عزیز حاجتی، مطبوعہ، دولہ کی حاجتی نمبر (حلقہ ادب سوناواری)

۲۔ ہفت روزہ آئینہ ”شخصیات نمبر“ سالنامہ ۱۹۶۹ء

سادگی پرست ہونے کے باوجود حاجتی صاحب زبردست نفاست پسند تھے۔ اُن کی نفاست پسندی کا اندازہ اُن کے مکان کے طرز تعمیر اور اُس مکان کے سامنے بنائے گئے باغ سے با آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں حاجتی سمجھو کہ عید کے دن پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں (بالغ ہونے کے بعد) شاید ہی کبھی گوشت کے بغیر کھانا کھایا ہوگا۔ لذت شناسی میں حاجتی ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ تمباکو پینا اُن کے عادات میں سے اہم تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی اس سے پرہیز نہیں کیا۔ وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے تو ڈاکٹروں نے تمباکو پینے پر پابندی لگا دی۔ شوگر (Dibetis) کا مرض لاحق ہونے کے بعد بھی پیتے رہے۔ جب کبھی کوئی جرأت کر کے کچھ کہتا بھی تو کہتے کہ تمباکو کو چھوڑنے سے نہ ہی کسی کی زندگی میں کمی ہو سکتی ہے اور پینے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔

پروفیسر حاجتی صاف گو ہونے کے ساتھ ساتھ تیز مزاج اور حاضر جواب انسان تھے۔ اُنکی حاضر جوابی کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اُن کا اپروچ ہمیشہ حقیقت پسندانہ ہوتا تھا۔ اس لئے انہیں سمجھنے میں تھوڑا سا وقت ضرور لگتا تھا۔ اس بارے میں مرزا غلام حسن بیگ عارف مرحوم رقمطراز ہیں۔

"It exhausted your patience to be his friend. He was so tough, rough, rustic and out spoken that it took quite some time to know the real humane, lovable Scholar behind his exterior."

تجسس، توکل، مہمان نوازی اور حاضر جوابی حاجتی صاحب کی زندگی کے خاص خاص امتیازات تھے۔ وہ ہر قسم کے لوگوں کی باتیں دھیان لگا کر سنتے تھے اور اہم باتوں کو کشکول میں جمع کرتے تھے۔

حاجتی صاحب نے کشمیری زبان کے کاز کو آگے لے جانے میں زبردست جگر کاوی کی۔ وہ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات و مشاہدات کا اظہار اکثر اسی زبان میں کرتے

رہے۔ حاجتی صاحب نے کشمیری زبان کو یونیورسٹی، کالجوں اور اسکولوں کے نصاب میں شامل کرانے کیلئے جی تو زحمت کی اور کشمیری یونیورسٹی کا ”کشمیری ڈیپارٹمنٹ“ اُن کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ حاجتی صاحب نے وادی کی مختلف ادبی انجمنوں کی داغ بیل ڈالی۔ ان انجمنوں میں ”ادبی مرکز کمر از سوپور“ حلقہ ادب سوناواری (حاجن)، ”کشمیر کلچرل آرگنائزیشن“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ حاجتی صاحب اور بھی بہت سارے اداروں اور انجمنوں کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ ریاستی کلچرل اکیڈمی کے ساتھ مختلف معاملات میں وابستہ رہے۔

پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ حاجتی صاحب تصنیف کے کاموں اور تنظیمی امور میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ اپنی صحت کے بارے میں اُنہیں فکر کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ جس کی وجہ سے ۱۹۸۵ء میں اُنہیں بیماریوں نے اس طرح دبوچ لیا کہ حاجتی محض ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے۔ دل اور آنکھوں کی بیماری کے ساتھ اُنہیں شوگر (Diabetes) کی بیماری بھی لاحق ہو چکی تھی۔ وہ چلنے پھرنے سے قاصر ہو گئے۔ پھر ۱۹۸۶ء میں ایک ایسی عجیب بات ہو گئی جس کا کسی کو اندازہ ہی نہ تھا۔ حاجن کی دھرتی پر پیدا ہونے والے اس قادر الکلام دانشور و مفکر، فصیح السان ادبی طوطے اور شگفتہ بیان عالم دین کی زبان بند ہو گئی۔ بقول سیکریٹری اوقاف حاجن۔

”شاید خدا کو اُن سے عالم برزخ میں واعظ تبلیغ کروانا تھا۔ شاید وہاں بہت ساری گھنٹیوں کو سلجھانا تھا۔ اسی لئے اس قادر الکلام اور حاضر جواب عالم کی زبان بند کر کے اس کی باتوں کو بچاکے رکھا۔“

رحمت حق ہونے تک حاجتی صاحب ایک زندہ لاش بن کر رہ گئے۔ آخر کار حاجن کے آسمان سے یہ خورشید ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ۱۴ جنوری ۱۹۹۳ء کو بروز سنچر وار دن کے تین بجے

غروب ہو گیا۔^۱ (انا للہ وانا الیہ راجعون) لیکن اس آسمان پر ایسی چھاپ چھوڑ گیا۔ جو جہاں ایک طرف آنی والی نسلوں کیلئے مشعل راہ ہے وہی دوسری طرف اُن کی یاد قیامت کی صبح تک دلاتی رہے گی۔

جہلم کے کنارے کھلے ہوئے اس قدیم و جدید امتزاج کے پھول کو بالکل اپنے گھر کے صحن میں جہلم کے کنارے کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا۔ بے شک اُن کا جسم زمین کے اندر دفن ہو گیا مگر اُن کی روح آج بھی ہماری رہبری اور رہنمائی کر رہی ہے۔ حاجتی تب تک زندہ و پایندہ ہے جب تک روئے زمین پر ایک بھی کشمیری موجود ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی



فصل دوم

محقق و نقاد حاجتی

- ۱۔ کتاب الطواستین کے شارح پروفیسر حاجتی
- ۲۔ پروفیسر حاجتی کے وہاب
- ۳۔ کلام دیگرے
- (الف) مولوی صدیق اللہ حاجتی
- (ب) کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ
- (ج) علامہ اقبال اور حلاج
- (د) آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی

پروفیسر محی الدین حاجنی کی ادبی خدمات

(اردو کے حوالے سے)

”حاجن“ کشمیر کے لسانی اور ادبی آسمان پر وہی اہمیت رکھتا ہے۔ جو اہمیت دُنیا ئے اُردو میں لکھنوی ادلی کو حاصل ہے۔ حاجن میں سینکڑوں سال تک ادبی روایات کو زندہ رکھنے والوں میں مولوی صدیق اللہ، وہاب پرے، اسد پرے، رمضان ڈار، لالہ تانترے، محمد کھار (شاہ گنڈ) پھر جدید دور میں کشمیر کی دھرتی کے عظیم سپوت، عربی کے عالم، اُردو اور انگریزی کے قلم کار اور کشمیری کے ہمدرد پروفیسر محی الدین حاجنی نے اس قدیم، عظیم اور مسلسل روایت کو آگے بڑھایا۔ عصر حاضر میں بھی حاجن اپنی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ آج بھی کئی نامور قلم کار تخلیق، تحقیق اور تنقید کے میدان میں برسرِ پیکار ہیں۔

لیکن ان سینکڑوں سالوں میں حاجن میں جو سب سے بڑا اور اہم نام پیدا ہوا۔ وہ نام ہے۔ پروفیسر محی الدین حاجنی۔ جو پورے ملک میں ہی نہیں بلکہ سرحد کے پار بھی جانے جاتے ہیں۔ کشمیری زبان و ادب حاجنی کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے کشمیری زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔ حاجنی کشمیری میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ کتاب ”مقالات“ مشہور ترقی پسند ڈرامہ ”گریس سند گر“، مشہور داستان ”الف لیلیٰ“، کشمیری ترجمہ، کشمیری شاعری پر کتاب ”کاشر شاعری“

کاثر نثریچ کتاب، کوثر ریڈر، وہاب پرے، ترجمہ مسدس حالی، گاموٹری پھیری پھیری، لکھ
رس، ان کے علاوہ کئی شاعروں کے دیوان بھی مرتب کئے۔ ان مکمل تصنیفات کے علاوہ
حاجتی صاحب نے کشمیری میں متعدد، تحقیقی، سائنسی، اور مذہبی مضامین لکھے ہیں۔

کشمیری میں حاجتی صاحب کس سہولیت سے قلم اٹھا سکتے تھے۔ اُس کا اندازہ اُن کی
کثرت تصنیفات سے لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر حاجتی ایک ماہر ترجمہ کار بھی تھے۔ انہوں نے
کئی مشہور کتابوں کے ترجمے کئے۔ ان میں شاعری، تصوف اور داستان شامل ہیں۔ شاعری
کے میدان میں انہوں نے حالی کے ”مسدس حالی“ کا ترجمہ کیا۔ تصوف میں انہوں نے
”منصور حلاج“ کی کتاب کو عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور مشہور داستان ”الف لیلا“ کو
بھی کشمیری میں ترجمہ کیا۔ مختصر اترجمہ کاری میں بھی حاجتی وادی میں اور وادی کے باہر ایک
نام اور مقام قائم کر چکے ہیں۔

پروفیسر حاجتی صاحب نے انگریزی میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے
انگریزی میں کئی معرکتہ آراء مضامین لکھے ہیں۔ سال ۲۰۱۰ء میں اُن کے انگریزی مضامین کو
حلقہ ادب سوناواری نے Discourses of Prof. Mohi U Din
Hajin کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب میں مختلف سائنسی، سماجی، ثقافتی
اور ادبی موضوعات پر دس مضامین شامل ہیں۔ حالانکہ انہوں نے انگریزی میں تقریباً بیس
سے زیادہ مضامین لکھے ہیں لیکن کوششوں کے باوجود بھی باقی مضامین کو ہم ڈھونڈ نہیں پائے
۔ پروفیسر حاجتی کے فرزند محمد امین پرے نے ہمیں بتایا کہ انگریزی مضامین کی ایک فائل علی محمد
اینڈ سنسز کے پاس تھی۔ جنہوں نے اُن کو چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پوچھے جانے پر انہوں
نے اس ضمن میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔

زبان اُردو میں بھی پروفیسر حاجتی نے قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ وہ اُردو میں کئی

۱۔ اس ڈرامہ کو پروفیسر شفیع شوق نے ترقی پسند ڈرامہ کہا ہے۔ بحوالہ بازیافت

مطبوعہ شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳

کتابوں اور بہت سارے مضامین کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب اصل میں اُن کی اُردو تصنیفات و تخلیقات کا ایک مدلل جائزہ ہے۔ حالانکہ اردو میں اُن کی کوئی مکمل تصنیف موجود نہیں ہے۔ لیکن کئی ایک موضوعات پر انہوں نے تسلسل کے ساتھ لکھا اور کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جس موضوع پر انہوں نے تسلسل کے ساتھ اردو میں لکھا اس میں وہاب پرے حاجی کی شاعری کی مختلف جہتیں سرفہرست ہے۔ انہوں نے منصور کی شہرہ آفاق تصنیف ”کتاب الطوا سین“ کی تشریح کر کے اپنی عربی دانی کا لاہا منوایا۔

اب ہم پروفیسر حاجی صاحب کی اُردو تصنیفات پر نظر ڈالتے ہوئے، ان کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔



کتاب الطوا سین کے شارح

پروفیسر حاجتی

حاجتی صاحب بچپن سے ہی کافی ذہین اور مخفی طالب علم تھے۔ ان ہی خصوصیات کی بنیاد پر حاجن جیسے علاقے سے نکل کر وہ معاشی تنگدستی کے زمانے میں بھی علی گڑھ پہنچ گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں حاجتی کا داخلہ ایم۔ اے عربی کورس میں ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں حاجتی صاحب اپنا زیادہ وقت کتب خانوں میں ہی گزارتے تھے۔ اپنی تعلیم کے دوران وہ زیادہ تر وقت یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے میں گزارتے تھے۔ اس کتب خانہ کے مخطوطات شعبہ میں جا کر کثرت سے مطالعہ بھی کرتے تھے۔ حاجتی صاحب نے علی گڑھ میں بہت جلد عربی زبان میں مہارت حاصل کی۔ منصور حلاج کے بارے میں حاجتی نے کہی نہ کہی کچھ نہ کچھ سنا ہی تھا۔ اسی لئے جب انہوں نے لٹن کتب خانے میں تیسری صدی ہجری کے جید صوفی منصور حلاج کی تصنیف ”کتاب الطوا سین“ دیکھی تو اُن کی دلچسپی اس تصنیف میں یکا یک پیدا ہو گئی اور انہوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ پڑھنے کے بعد انہوں نے ان اقوال کو نقل کیا۔ جب علی گڑھ سے فارغ ہو کر واپس آئے تو اُن اقوال کو اردو میں ترجمہ کیا۔ ان اقوال کو ترجمہ کرنے کے پس پردہ یہ نیت تھی کہ منصور حلاج کے بارے میں لوگوں میں ایک حقیقی جانکاری پھیلائی جائے۔ منصور کی زندگی کو یہاں کے لوگوں اور شعراء نے مفروضات اور جھوٹ کا پلندہ بنادیا تھا۔ منصور کے بارے میں مدیر رسالہ گلریز محمد امین بڑھ لکھتے ہیں:-

”ابالمغیث حسین ابن علی المنصور الحلاج تیسری صدی ہجری میں دارالسلام بغداد میں پیدا ہوئے۔ اور ذی قعدہ ۳۰۹ھ میں تختہ دار پر چڑھائے گئے

اُن کے معتقدات نے ایک مذہبی انقلاب پیدا کر دیا۔ جس کے آثار
آج تک ایرانی اور کشمیری ادب میں پائے جاتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں
نے اُن کی زندگی کو چیتاں بنا ڈالا ہے۔“

حقیقت بھی یہی ہے منصور کے بارے میں یہاں کے لوگوں نے بغیر جانے اور پڑھے
وہ باتیں گڑھ لیں جن کا منصور کے ساتھ دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ کشمیر کے صوفی
شاعروں نے منصور کو ایک دیو مالائی کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ منصور کے بارے میں
کسی شخص یا پھر عالموں کو جاننے کی نہ شاید ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی فرصت ملی۔ مولانا
جلال الدین رومیؒ جو ایک بلند پایہ صوفی بزرگ اور فارسی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے،
منصور حلاج کے ایک بہت بڑے معتقد تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ منصور حلاج کو چند غلط کار، تنگ
نظر اور بے علم مذہبی عالموں کے غلط فیصلے کے نتیجے میں سولی پر چڑھایا گیا۔ اسی لئے وہ کہتے
ہیں۔

چوں قلم در دستِ خداڑے فتاد
لاجرم منصور برادرے فتاد

جب محی الدین حاجتی کی نظر علی گڑھ یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے میں تیسری صدی
ہجری کی صوفیانہ شاہکار ”کتاب الطواسین“ پر پڑی تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ
اس کتاب کی اُردو میں تشریح کی جائے۔ یوں بھی حاجتی صاحب کو تصوف کے فلسفے پر اور بجنل
دسترس حاصل تھا۔ لیکن معاملہ یہ درپیش آیا کہ لٹن (LYTHON) کتب خانے کے اس
شعبہ میں کسی کو کاغذ اور پینسل ساتھ لے کر اندر جانے کی اجازت نہیں تھی، کسی مسودے کو باہر
نکلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن حاجتی علی گڑھ میں اس بات کا ارادہ کر چکے تھے کہ

۱۔ ادارہ ”گکریز“ جون ۱۹۵۳ء

اس کتاب کو ترجمہ کرنا ہی پڑے گا۔ اسلئے وہ ہر دن اس کتب خانے میں جا کر، مسودے کے کچھ صفحات کا مطالعہ کرتے اور شام کو ہوٹل میں جا کر اپنے ذہن کی مشق پر کندہ الفاظ کو کاغذ پر اُتارتے۔ یہ سلسلہ ایک مہینے تک جاری رہا۔ اس طرح ایک مہینے میں ہی حاجن کے سپوت نے کتاب کی نقل مکمل کر لی۔^۱

کتاب کی نقل مکمل کرنے کے بعد وہ مرحلہ آیا جو نقل کے بعد ہر کتاب اور مصنف کو پیش آتا ہے۔ یعنی تقابلی کا مرحلہ۔ اصلی اور نقلی مسودوں کا مقابلہ کر کے خامیوں اور کمیوں کو پورا کرنا تھا۔ لیکن اس کی کوئی راہ نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ اس لئے یہ بات چیف لائبریرین تک پہنچائی گئی۔ جب انہوں نے حاجتی کا نقل کیا ہوا مسودہ دیکھا تو وہ حاجتی صاحب کا قوتِ حافظہ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ انہوں نے دونوں مسودوں کا مقابلہ کیا۔ اور صرف کچھ غلطیوں کو ٹھیک کر کے اُسے واپس حاجتی صاحب کو لوٹا دیا۔ اس واقعہ کے متعلق جسٹس غلام نبی گوہر خوجہ مبارک شاہ کا حوالہ دیکر رقمطراز ہیں۔

”منصور حلاج کی کتاب الطواسین کی دُنیا بھر میں چند ہی نقلیں موجود تھیں۔ حاجتی نے اس کا مطالعہ کر کے اس کتاب کو حاصل کرنے کی خواہش کی، مگر کیسے حاصل کر لے۔ تو پھر از سر نو دس پندرہ صفحے پڑھ کر کمرے میں آ کر اتنا حصہ کاغذ پر اُتارا کرتے تھے۔ اس طرح سے کتاب کی نقل مکمل ہوئی۔ مگر مقابلہ کرے تو کیسے۔ آخر چیف لائبریرین صاحب نے ماجرا سنا۔ انہوں نے نقل کا مقابلہ مسودہ کے ساتھ کر کے

۱ ”محی الدین حاجتی تاریخی حقیقت یا اساطیری عظمت“ از غلام نبی گوہر مطبوعہ
 وہلر کٹر حاجتی نمبر

آپکو یقین دے دیا، کہ ایک دو معمولی غلطیاں تھیں۔ اسی نقل کی بناء پر آپ نے تصوف کے اس ماخذ رسالہ کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔“

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی تعلیم (ایم۔ اے۔ عربی اور ایل۔ ایل۔ بی۔) مکمل کرنے کے بعد جب حاجتی صاحب واپس کشمیر پہنچے۔ تو انہوں نے کتاب الطوا سین کے اُن اقوال کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ جن کی نقل انہوں نے علی گڑھ میں کی تھی۔ اور بعد میں اُس ترجمہ کو رسالہ گلریز کے اگست، نومبر، دسمبر ۱۹۵۳ء اور فروری اور اگست ۱۹۵۴ء کے شماروں میں قسط وار شائع کیا گیا۔ اصل میں حاجتی صاحب نے کتاب الطوا سین کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے پہلے اس کتاب پر ایک سرسری تبصرہ کیا اور بعد میں اس کے کچھ اقوال کی تشریح کی۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں رسالہ گلریز میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ حاجتی صاحب کتاب الطوا سین کے متعلق رقمطراز ہیں۔

”کتاب الطوا سین کے اندازِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ منصور نے خود یہ کتاب نہیں لکھی ہے۔ بلکہ یہ منصور کے اُن اقوال کا مجموعہ ہے۔ جو اُس نے عالمِ وجد میں کہے ہیں اور اس کے مریدوں نے جمع کر کے ان کو کتابی صورت میں قلم بند کر دیا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، پوری کتاب کا مربوط المضامین ہونا تو درکنار، ہر ایک طس میں مختلف اقوال الگ الگ نمبر وار درج ہیں۔ جو ایک بار ارادہ مصنف کا طریقہ تصنیف نہیں۔“

جب کتاب الطوا سین کی پہلی قسط جولائی ۱۹۵۳ء میں گلریز میں ”طاسین السراج“ کے عنوان سے چھپی۔ تو اہل علم و دانش نے حاجتی کے اس کارنامہ کو سراہا۔ پھر جب دوبارہ یہی قسط اگست ۱۹۵۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد امین بڑھ نے

حاجتی ایک متحرک دارالمعارف“ از غلام نبی گوہر مطبوعہ بانیات شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

گلریز کے ادارہ میں ایک طرف اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے اور دوسری طرف حاجتی صاحب کو جوش دلانے کیلئے یوں کہا۔

”اس شمارے میں سب سے پہلے ادارہ ”گلریز“ کی طرف سے منصور حلاج پر ایک مختصر سا تعارفی مضمون لکھا گیا ہے جس میں اعلان کیا گیا ہے۔ کہ منصور کے اقوال کا مجموعہ کتاب الطواسین ادارہ کے ہاتھ لگا ہے۔ جس کے عربی متن کو اردو شرح و تفسیر کے ساتھ گلریز میں بہ اقساط شائع کیا جائے گا۔ تشنگانِ علمی کیلئے یہ خبر انتہائی فرحت اثر ہے۔ برصغیر ہند میں اردو داں طبقہ اس مجموعہ کے اقوال اور ان کی اردو تشریح و ترجمہ کیلئے چشم براہ رہے گا۔ منصور حلاج کی شخصیت ابھی پردہ راز میں ہے اور اہل تصوف کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ عام تعلیم یافتہ طبقہ کو اتنا ہی معلوم ہے کہ منصور نے ”انا الحق“ کا نعرہ دیا اور وہ سولی پر چڑھائے گئے۔ گو علامہ اقبال نے ”جاوید نامہ“ میں حلاج کی شخصیت کا اہل علم و فکر سے تعارف کرایا۔ مگر پھر بھی اس بات کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ اس واقع المرتبت صوفی کے اقوال سے اس کی شخصیت اجاگر کی جائے۔ تاکہ منصوریت کو سمجھنے میں کماحقہ آسانی ہو۔

ادارہ گلریز کے سرگرم اور قابل رکن پروفیسر محمد الدین حاجتی اگر ان اقوال کی تشریح کرنے کا بیڑا اٹھائیں تو کشمیر کے اہل علم اُن کے مرہون

منت نہیں گے۔ کیونکہ حلاج کے اقوال کی تفسیر لکھنا اُن ہی کا کام ہو سکتا ہے۔“^۱

بزم ادب کشمیر کے ارکان و عہدیداران کو اس بات کا بھروسہ تھا کہ اگر پروفیسر محی الدین حاجتی نے رسالہ ”گلریز“ کو اپنے قلم کی روشنائی سے روشن کیا۔ تو اس رسالہ کی روشنی بہت دور تک پھیل جائے گی۔ خصوصاً اگر وہ منصور کے اقوال کی تفسیر اس رسالہ میں جاری رکھیں گے تو اہل فکر و دانش کی نظروں میں اس رسالے کی وقعت بہت بڑھ جائے گی۔ کشمیر چونکہ صوفی فکر اور عمل کا ایک بہت بڑا مرکز رہا ہے اسلئے یہاں کالوگوں کو منصور کے ساتھ عقیدت کا رشتہ تھا۔ اسی وجہ سے حاجتی صاحب کے اس کام کو لیکر گلریز سے وابستہ سبھی لوگ خوش بھی تھے اور جذباتی بھی۔ ان باتوں کا اعتراف محمد امین بڑھ جولائی ۱۹۵۳ء کے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے کرتے ہیں۔

”اگر منصور کے اقوال کی تشریح کا سلسلہ مضامین رسالہ گلریز میں شائع ہوتا رہا تو یہ رسالہ علمی دنیا کے اونچے پایہ کے علمی رسائل میں شمار ہو سکے گا۔ کتاب الطوا سین کا صرف فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔“

منصور حلاج کے اقوال کا جہاں تک تعلق ہے۔ اُس کے مریدوں نے اُنکو جمع کر کے کتابی شکل دی۔ پروفیسر محی الدین حاجتی نے اُن اقوال کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے سے حاصل کر کے اُنکی تفسیر کی۔ جسکو پڑھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منصور عشق محمدی میں ڈوبا ہوا شمع رسالت کا پروانہ تھا۔ جس نے عشق محمدی کی حقیقت کو جان لیا تھا۔ وہ اویسی فکر سے روشنی حاصل کر کے دنیا داری و دنیاوی بندشوں اور معاملات سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

ماہنامہ ”گلریز“ اگست ۱۹۵۳ء

۱

پروفیسر حاجتی کے مضامین کو پڑھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ منصور حلاج
 عشق و عرفان کا سرمست دنیا جہاں سے بے خبردن رات عالم وجد میں رہا کرتا تھا۔ دنیا
 پرست عالموں اور ریاکاروں نے اُس کے جذبہ عشق کو بغیر سمجھے اس کی عرفانی سوچ اور صحیح
 باتوں پر اُسے ملحد اور زندیق کہہ کر اُس سے بے عمل اور ظالم قانون کے ہاتھوں سولی پر
 چڑھوایا۔ قانون وقت کو نافذ کرنے والے بے روح حکمران اس بات سے نابلد تھے کہ عشق
 اور علم کی منزل اصل میں قرب الہی اور اللہ کو پہچاننا ہے۔ لیکن اس مقام کو حاصل کرنے کیلئے یا
 اس مقام تک پہنچنے کیلئے ان کے راستے الگ الگ ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ عشق نے کبھی
 نتائج کی پرواہ نہیں کی ہے جبکہ علم ہمیشہ نتائج کو دیکھتا ہے۔ یہی فرق کاروبار دنیا چلانے والے
 لوگوں کو عشق سے بیزار کرتی ہے۔ اس صداقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ جہاں عشق و
 عرفان ایک ہی جست میں تمام فاصلے طے کرتا ہے وہاں علم کو پہنچنے میں صدیاں لگتی ہیں۔ جو
 بات عشق آج سے ہزاروں سال پہلے جانتا تھا۔ وہ آج بھی شاید علم کو پتہ اور معلوم نہیں۔ اسی
 وجہ سے دنیا پرست عالم عشق کے معاملات میں ہمیشہ غلط فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں۔ وہ
 عشق و عرفان کو علم کا رقیب سمجھتے ہیں جو کہ سراسر اُن کا علمی، عقلی اور استدلالی دھوکہ ہے۔
 حقیقت میں علم اور عشق ایک ہی سوتے سے پھوٹی دوندیاں ہیں اور ایک ہی سمندر کی اور بہنے
 والے دو دریا ہیں۔ علم و عرفان کے رشتے کی حقیقت کا اظہار حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال
 بڑے خوبصورت پیرائے میں اس کمال یقین کے ساتھ کرتا ہے۔

رقابت علم و عرفان میں غلط بینی ہے منبر کی

کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

پروفیسر محی الدین حاجتی نے ”کتاب الطوائفین“ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان سارے

حقائق کے ساتھ مدلل بحث کی ہے۔ انہوں نے تصوف، عرفان، عشق اور علم کے درمیان تمام ممکنہ رشتوں اور رنجشوں پر عالمانہ اور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ حاجتی صاحب کے اس کارنامہ پر تبصرہ کرتے کشمیر بزم ادب کے رکن محمد بڑھ لکھتے ہیں۔

”منصور کے اقوال کی عالمانہ تفسیر و تشریح لکھ کر پروفیسر موصوف نے ایک ایسا لطیف قصہ چھیڑا ہے۔ جس سے فی الواقع گل ریز کا رتبہ بلند ہو گیا ہے۔ اب یہ بات بلا کسی تردید کے کہی جاسکتی ہے۔ کہ منصوریت کو سمجھنے کیلئے پیرس یونیورسٹی کی لائبریری (جہاں کتاب الطوا سین کا فرانسیسی ترجمہ پروفیسر لوی مینسن کا کیا ہوا موجود ہے) جامعہ استنبول کا کتب خانہ (جہاں کتاب الطوا سین کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے) اور رسالہ گل ریز (جس میں ان اقوال کی تشریح و تفسیر ہو رہی ہے) کی فائیل یکساں طور پر کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔“^۱

اس طرح پروفیسر محی الدین حاجتی نے عربی زبان کی ایک بلند قامت اور ہنگامہ خیز شخصیت کے اقوال کا ترجمہ اور تفسیر کر کے، جہاں ایک طرف اردو ادب کے میدانِ تصوف میں اضافہ کیا وہی دوسری اور رسالہ گل ریز کا مقام بھی بلند کر دیا۔ ان اقوال کی تفسیر و ترجمہ کرنے کا بیڑ اٹھا کر حاجتی نے ایک عظیم علمی، فکری، فلسفی اور صوفی ترانہ چھیڑا تھا۔ مگر ناداری قسمت یہ کہ حاجتی لاابالی طبیعت کے مالک انسان تھے۔ جو من میں آیا وہ کیا۔ کبھی کوئی قصہ چھیڑا تو کبھی کوئی۔ یکسوئی کے ساتھ کسی ایک چیز سے من نہیں لگاتے تھے۔ دوسرا کشمیری زبان و ثقافت کی فکر سے وہ دوسرے کاموں میں جی لگا ہی نہیں پاتے تھے۔ اگر انہوں نے ”کتاب الطوا سین“ کی تفسیر کا کام مکمل کیا ہوتا تو یہ اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوتا۔ لیکن دیگر مصروفیات کی وجہ سے وہ یہ کام مکمل نہیں کر سکے۔ ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرنا ضروری

۱۔ ماہنامہ ”گل ریز“ سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء

سمجھتا ہوں کہ حاجتی صاحب نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور سب سے زیادہ کشمیری زبان میں۔ انہوں نے کسی ایک موضوع پر یکسوئی کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا، بلکہ متنوع موضوعات کو اپنی قلم کی جولانی سے دوام بخشا۔ وہ ڈرامہ بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی۔ تنقید میں زور آزمائی کی ہے اور تحقیق میں بھی۔ سائنسی گتھیاں بھی سلجھائی ہے اور سماجی معاملات کی گرہیں بھی کھولیں ہیں۔ انہوں نے ادب کے گیسو بھی سنوارے ہیں اور تاریخ پر بھی تازیانہ لکھا ہے۔ جب کوئی شخص اتنا لکھتا ہے تو پھر اپنے لکھے ہوئے کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاید ایسا ہی کتاب الطوا سین کے ساتھ بھی ہوا ہو۔ اس کے باوجود بھی اہل علم اور ادب نواز لوگوں کی چیر ادتی دیکھئے کہ جو تفسیر و ترجمہ انہوں نے کیا، اُس کو ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں کیا گیا۔

جہاں تک اس تفسیر کے اسلوب کا تعلق ہے اس کی زبان خواص پسند ہے۔ حاجتی صاحب نے صاف، شستہ اور خالص ادبی زبان کا استعمال کیا ہے۔ اُن کا یہ کارنامہ دیکھ کر اُنکی ناقدانہ بصیرت، محققانہ نظر اور عالمانہ قوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور اُن کے علمی قد و قامت کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے۔



پروفیسر حاجتی کے وہاب

حاجن کشمیری زبان کا گلستانِ ادب ہے۔ جن پھولوں کی مہک سے کشمیر اور کشمیری زبان کی کائنات مہک رہی ہے اُن پھولوں میں کئی پھول اسی حاجن کے گلستانِ ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے ہی پھولوں میں ایک پھول عبد الوہاب پرے حاجتی ہے۔ وہاب پرے حاجتی کشمیری زبان کے ایک بسیار گوشاعر ہے۔ جس ماحول میں وہاب نے آنکھیں کھولیں اور اپنے شعور کو پہنچ گئے، وہ کشمیری شاعری کے شباب کا ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ رحیم صاحب، نعمہ صاحب، محمود گامی، پرمانند، مقبول کراہ واری اور رحمان ڈار جیسے شاعروں کے جانشین ہونے کے علاوہ، رسول میر، وہاب کھار، لکشمی بلبل، شمس فقیر اور احمد بٹاری جیسے بلند پایہ شاعروں کے ہم عصر ہیں۔

جہاں کشمیری زبان کے دوسرے شاعر اپنی جوانی ہی میں وادی اور وادی کے باہر مشہور ہوئے۔ وہاں وہاب پرے اپنے بڑھاپے میں بھی لوگوں تک پہنچ نہیں سکے۔ حالانکہ حاجن اور اس کے ماحقہ علاقوں میں لوگ وہاب پرے اور اس کی شاعری سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے گرویدہ تھے۔ لوگ اُن کی شاعری مختلف سماجی اور دوسرے موقعوں پر گاتے تھے۔ شادی بیاہ اور کاشتکاری کے دوران اُن کی شاعری کی ہر طرف دھوم ہوتی تھی۔ لیکن ان علاقوں سے باہر انہیں شاید ہی کوئی جانتا تھا۔ انہیں کشمیر اور کشمیری ادب نوازوں کے سامنے متعارف ہونے کیلئے تقریباً اپنی موت کے بعد پچاس سال کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ پروفیسر محی الدین حاجتی ہی تھے جنہوں نے وہاب پرے حاجتی کو کشمیریوں کے سامنے متعارف کرنے

کے ساتھ ساتھ اُن کی ادبی عظمت کا سکہ بھی جمادیا۔

ابھی رسالہ ”گلریز“ اپنے ابتدائی مراحل ہی طے کر رہا تھا کہ اس کے دسمبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں پروفیسر حاجتی کا مضمون ”کشمیر کا فردوسی۔ وہاب پرے“ شائع ہوا۔ یہ مضمون وہاب پرے کے متعلق ایک تعارفی مضمون تھا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے وہاب پرے کی زندگی کے مختلف گوشوں پر عالمانہ اور محققانہ بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہاب پرے کی زندگی کے متعلق کسی محقق نے قلم اٹھایا۔ اس مضمون سے جہاں قارئین ”گلریز“ کو وہاب پرے کے متعلق جانکاری حاصل ہوئی۔ وہی انہیں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ پروفیسر محی الدین حاجتی صرف ایک اُستاد ہی نہیں بلکہ ایک منجھے ہوئے محقق اور ایک باریک بین نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے بہت بڑے مزاج شناس بھی ہے۔ رسالہ ”گلریز“ کے ساتھ منسلک ہونے کے بعد پروفیسر حاجتی نے وہاب پرے کے ادبی کارناموں سے لوگوں کو اس طرح روشناس کیا۔ کہ اُن پر وہاب پرے کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ رسالہ گلریز کے مختلف شماروں میں پروفیسر حاجتی کے جو مضامین وہاب پرے کی زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کے متعلق شائع ہوئے۔ اُن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

- ۱۔ ’ فردوسی کشمیر۔ وہاب پرے ماہنامہ گلریز دسمبر ۱۹۵۲ء
- ۲۔ کشمیر کا فردوسی۔ ادب کی دنیا میں گلریز مارچ و اپریل ۱۹۵۳ء
- ۳۔ وہاب۔ فردوسی ایران کی دنیا میں گلریز سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء
- ۴۔ کشمیر کا فردوسی۔ تصوف کی دنیا میں ماہنامہ گلریز مئی ۱۹۵۳ء
- ۵۔ وہاب۔ بحیثیت مورخ کشمیر ماہنامہ گلریز مارچ ۱۹۵۴ء

ان مضامین نے وہاب پرے کو زمانہ کی گمنامیوں سے نکال کر کشمیر کے بلند پایہ شاعروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ وہاب پرے، جس کو محی الدین حاجتی کے سر ینگرائس۔ پی۔ کالج تبدیل ہونے تک کوئی نہیں جانتا تھا، پروفیسر حاجتی کی بدولت ایران پہنچ کر لافانی بن گئے۔ پروفیسر حاجتی کے مضامین نے وہاب پرے کو زمانے کے دھندلکوں سے نکال کر کشمیر کے گھر گھر تک پہنچانے کے ساتھ ہی فارسی زبان کے عظیم شاعر فردوسی کے مقابل بھی کھڑا کر دیا۔ اس طرح وہاب پرے کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق کشمیر کے اہل ذوق، شعر فہم اور کشمیری زبان کے خیر خواہ قبیلے کو نہ صرف جانکاری حاصل ہوئی بلکہ اُن کی شاعرانہ عظمت کا بھی اُن کو اندازہ ہو گیا۔

پروفیسر محی الدین حاجتی نے وہاب پرے کے متعلق پہلا مضمون ”فردوسی کشمیر۔ وہاب پرے“ کے عنوان سے لکھا۔ اس میں وہاب پرے کے حالات زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجتی اُن حالات کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں جن حالات میں وہاب پرے حاجن میں پیدا ہوئے۔ وہاب حاجتی کے حالات زندگی کی آڑ میں پروفیسر حاجتی بیچہ نامہ امرتسر اور اس دور میں کشمیریوں پر کئے جارہے ظلم و جبر کی داستان کھلم کھلا اور درد و کسک کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ کشمیریوں کی غریبی، بے چارگی اور مظلومیت کا بیان اس انداز سے کرتے ہیں۔

”وادی کشمیر کے دور افتادہ دیہات میں ابھی یہ حسرتناک خبر سنائی نہیں گئی تھی کہ سکھوں کی ستائیس سالہ ”سکھ شاہی“ کا خاتمہ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۶۲ھ کو بیچہ نامہ امرتسر کے سونا البدل سے ہو چکا ہے۔ ابھی ایک کشمیری کی زندگی کا معاوضہ بیس نانک شاہی روپیہ سے گھٹ کر اڑھائی

روپیہ ضرب شاہی تک نہیں پہنچا تھا۔ ابھی پوری وادی پر استبداد، لوٹ اور عصمت دری کے کارندے کالی گھٹاؤں کی صورت میں چھائے ہی ہوئے تھے۔ ہر جگہ افلاس، بے چارگی، مظلومیت اور احساس کمتری کے بھیاں تک مناظر ابھی تاریخ کشمیر میں بد نما ترین شواہد کا اضافہ کر رہے تھے کہ اسی پر آشوب اور درد انگیز سال میں عبدالوہاب پرے جو کہ اپنے شعری کارناموں میں صرف وہاب تخلص کرتے تھے۔ ۱۴ ماہ شعبان ۱۲۶۲ ہجری کو سوموار کے دن تحصیل سونا واری کے ایک گاؤں حاجن میں کتم عدم سے منصب شہود پر جلوہ گر ہوئے۔^۱

پروفیسر حاجتی نے وہاب پرے کی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہوئے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی شخصیات کی زندگیوں کو لوگ عقیدت یا لاعلمی کی وجہ سے اساطیری بنادیتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے وہاب کی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہوئے کسی قسم کے مبالغے یا غلو سے احتراز کیا۔ وہاب کے ہم عمر بزرگ لوگوں سے اس کی زندگی کے بارے میں ایک ایک بات کرید کرید کر ہمارے سامنے رکھی۔ اس سوانحی مضمون کو لکھنے کے دوران پروفیسر حاجتی ایک سچے اور دیانتدار محقق بن کر اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔

وہاب پرے کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد پروفیسر حاجتی نے اُن کو اہل علم و ادب کے سامنے ایک باوقار اور ہمہ جہت ادیب کی حیثیت سے پیش کیا۔ ”کشمیر کا فردوسی۔ ادب کی دنیا میں“ مضمون لکھ کر انہوں نے وہاب پرے کے ادبی کارناموں، اسکی مختلف ادبی

۱۔ ماہنامہ ”گلریز“ دسمبر ۱۹۵۲ء

جہات اور موضوعات کو موضوع بحث بنایا۔ یہ مضمون گلریز کے مارچ اور اپریل ۱۹۵۳ء کے دو شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہاب پرے بسیار نویسی میں کشمیری زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے لکھا اور بہت لکھا۔ متنوع موضوعات کو اپنے قلم کی جولانیوں سے روشن کیا۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر انہوں نے قلم آزمائی نہ کی ہو، لیکن دنیا کی ناپائیداری اور سماجی معاملات کی آناکانی اس کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ جب کوئی شاعر بہت زیادہ لکھتا ہے تو معیار کبھی کبھار مقدار کی بھیٹ چڑھ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاب کے یہاں صرف مقدار (quantity) ہے اور معیار (quality) نہیں۔ بلکہ اُنکے یہاں اعلیٰ پایہ کی شاعری بھی موجود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام و خواص وہاب پرے کے کارناموں سے بے خبر تھے۔ پروفیسر حاجتی نے اُن کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ اُن کا دبدبہ کشمیری شاعری میں قائم ہوا۔ پروفیسر حاجتی نے وہاب پرے کو متعارف کرانے میں وہی کام کیا جو کام مولانا حالی نے غالب اور اُن کے شعری کارناموں کو منظر عام پر لانے کیلئے کیا ہے۔ مضمون کے آغاز میں وہاب کے ادبی قد کا دبدبہ قائم کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی اُن کے دستیاب اور عدم دستیاب کلام کی بات چھیڑتے ہی اُن کی ادبی عظمت کا سکہ بٹھا دیتے ہیں۔

”وہاب کے ادبی شاہکاروں کا نقد و تبصرہ ایک مختصر مضمون میں کرنا ناممکن ہے کیونکہ دیوان وہاب سے قطع نظر صرف اُن تواریخی اور تالیفی اشعار کی تعداد جو زمانے کی دست برد سے بچ گئے ہیں ۴۵ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ نونہال، گل بدن، ہفت قصہ غمی، ہفت قصہ مکرزن، قصہ چار درویش اور بے بوج نامہ وغیرہ اُن کی تخلیقات ہیں جو دستیاب نہ ہونے کے سبب تنقیدی بحث

سے خارج رکھنا پڑیں گی۔ اگر صرف دیوانِ وہاب کی تنقید مد نظر ہو۔ تو یہاں تیس ردیفوں میں لکھی ہوئی سات سو اکیاسی (۷۸۱) منظومات ہیں۔ جو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق کچھ نہ کچھ مواد فراہم کرتی ہیں۔ اور جو تمام اضافہ خن میں کلاسیکی صنائع و بدائع کا ایک ایسا دل ربارقع ہے۔ جو اختصار پسند نقاد کو بھی، بسیار نویسی کی طرف مائل کرے اور جس کی ادبیت کے چند امتیازی نقوش اور حد بندی کی نمایاں لائنوں کو کھینچتے ہوئے بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہاب کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے۔

وہاب پرے کو فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ تھا۔ وہ فارسی شاعری کی مختلف ہیئتوں، اصطلاحات اور دیگر شعری نزاکتوں سے بھی واقف تھے۔ اُس کے ہم عصر شعراء و ادیب کشمیری شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب کو ٹھونسا فیشن سمجھتے تھے۔ وہاب نے بھی اس روایت کی پیروی کرتے ہوئے اپنی ابتدائی شاعری میں فارسی زبان کو کشمیری کلام میں سجا کر اپنی شاعری کو خُسن بخشا ہے۔ لیکن آگے چل کر وہاب اس فیشن پرستی سے منہ موڑ کر خالص کشمیری زبان کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہاب پرے کے لسانی برتاؤ کے بارے میں بات کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی رقمطراز ہیں۔

”اس زمانے میں جبکہ فارسی کو کشمیری میں جا بجا ٹھونسا فیشن میں شمار ہوتا تھا۔ وہاب اس لسانی نظام پیوند سے اپنے ابتدائی کلام میں بھی ایک ایسا لطیف اور دل آویز امتزاج پیدا کرتا ہے۔ جس میں فارسیّت بتدریج کشمیریت میں مدغم ہوتی جاتی ہے۔“

پروفیسر حاجتی نے اس مضمون میں وہاب پرے کی شاعری کے موضوعات، اُنکے انداز بیان، مختلف شعری صنعتوں کے استعمال اور دیگر شعری اور فنی محاسن کو موضوع بحث بنایا ہے۔

۱، ۲ ماہنامہ گلزارِ ج ۱۹۵۳ء

پروفیسر حاجتی نے وہاب کی شعری زمینوں کو الگ الگ کر کے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایک بات اہم ہے کہ حاجتی صاحب نے تفصیل کے ساتھ وہاب کے فنی محاسن پر بات نہیں کی ہے۔ بلکہ سرسری طور سے ہر چیز کی جھلک سی دکھا کر آگے بڑھتے ہیں۔ وہاب کے عشقیہ کلام پر بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

”وہاب کے عشقیہ کلام میں نہ سبکی نظر آتی ہے نہ شہوانی ہیجان، نہ سفلہ پن ملتا ہے اور نہ جذباتی سفاہت۔ ہاں زمانہ کی بسیط اور آفاقی نیرویگیوں کے گہرے مشاہدے سے وہاب اپنی ”ہیچ مدانی“ کو بار بار محسوس کرتا ہے اور یہ احساس علی العموم خوف زدگی یا احساس کمتری کی صورت اختیار کرتا ہے۔“^۱

کبھی کبھار کچھ اشعار پر حاجتی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر قاری شاعر کو بھول کر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ شعر فنی ایک بہت بڑا گن ہے اور یہ سب میں نہیں ہوتا ہے۔ حاجتی صاحب غضب کے شعر شناس اور شعر فہم تھے۔ جس کا برملا ثبوت انہوں نے وہاب کے اشعار کے نقد و تبصرے کے دوران کیا۔ انہوں نے وہاب کے اشعار کو ایسے جامے پہنائے کہ شاید ہی کبھی شاعر نے بھی سوچا ہو۔ اشعار میں معنوی امکانات تلاش کرنا تو ایک بات ہے لیکن حاجتی صاحب وہاب کے اشعار کی معنوی جہات ٹٹولتے ٹٹولتے ایک نیا جہان معنی پیدا کر دیتے ہیں۔ پروفیسر حاجتی کو نفسیات کے علم سے بھی گہرا شغف تھا۔ وہاب کے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے وہ نفسیاتی گراہیں بھی کھول دیتے ہیں۔

”تحت الشعوری حدت شعور میں علی العموم تضاد پندری کا سلیقہ پیدا کرتی ہے اور بلوغ نظریہ حقیقی ادبیت کا کمال یہ ہے کہ اس مقام پر شاعر جذبات کی رو میں بہہ جانے کے بجائے متضاد عناصر کو یوں ہم آہنگ کرے کہ سننے والے کو شاعر کے ذہنی تلاطم کا پتہ ہی نہ چلے اور وہ اپنے ذہنی محور کو بھی شاعر کے مدار پر ہی

۱۔ ماہنامہ گلریز مارچ ۱۹۵۴ء

گامزن محسوس کر سکے“^۱

ان مضامین میں پروفیسر حاجتی نے وہاب کی شاعری کی خوبیوں کو ایک ایک کر کے گنا۔ خوبیوں کو بیان کرتے کرتے پروفیسر حاجتی صاحب ایک غیر جانبدار نقاد کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہونے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ وہ کہیں بھی وہاب کی کسی ایک شاعرانہ خامی یا نقص کا تذکرہ نہیں کرتے ہیں۔

”وہاب کے مشکل ردیف مشکل تر قافیہ کے متقاضی ہیں۔ لیکن کاوشِ فکر کی کامیابی اور شگفتگی بیان دیکھئے کہ دشوار گزار زمینوں میں بھی وہاب ”خوش رفتار“ رہا اور جہاں جہاں سخن وری کے لوازم شدید صورت اختیار کرنے لگے، وہاب گھبرانے کے بجائے ایسی نادر مرصع کاری کرنے لگا کہ ہر لفظ پوری بندش سے چُست، ہر خیال بے تکلفانہ آمد کا آئینہ دار اور ہر قافیہ بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔“^۲

وہاب کے ساتھ یہ پروفیسر حاجتی کی عقیدت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اس کی شاعری کی خوبیاں بیان کرتے کرتے اس کی خامیوں سے صرفِ نظر کر گئے۔ یہ خالص عقیدت مندی تھی باقی کچھ نہیں۔

وہاب پرے کا سب سے بڑا کارنامہ ”فردوسی“ کے ”شاہنامہ“ کا کشمیری ترجمہ ہے۔ وہاب نے ”شاہنامہ“ کا ترجمہ کسی تحریک یا محبت کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ کام انتہائی غصہ میں انجام دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل حاجتی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”حاجن کا ایک مولوی زادہ قاضی غلام رسول پنجاب کی سیاحت کے دوران میں اس کا ایک نسخہ خرید کر لایا۔ اور وہاب نے ۱۲۹ھ سے پہلے پہلے کسی دوست کی وساطت سے شاہنامہ کا یہ نسخہ دیکھا۔ قاضی صاحب نے زیادہ دیر

۱ ماہنامہ ”گلریز“ اپریل ۱۹۵۳ء

مطالعہ کی مہلت نہ بخشی اور اپنے کسی رشتہ دار کے ذریعہ اشتعال انگیز لہجہ میں پیغام بچ دیا کہ ”شاہنامہ واپس کرو۔۔۔۔۔ یہ مجھے مثنوی سے بھی زیادہ عزیز ہے“ اس پیغام کے سننے کی دیر تھی کہ وہاب برفروختہ ہو گیا اور گویا ہوا۔“

اس ترجمہ میں ترجمہ کی جگہ تخلیق کی شان جھلکتی ہے۔ وہاب پرے کے اس کارنامہ سے متاثر ہو کر ہی پروفیسر حاجی نے وہاب پرے کو ”کشمیر کا فردوسی“ قرار دیا ہے۔ حاجی صاحب کا اور ایک مضمون گلریز میں ”وہاب۔ فردوسی ایران کی دنیا میں“ کے عنوان سے سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء میں چھپا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجی وہاب پرے اور فردوسی کے حالات زندگی کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے وہاب کو ایک خوش بخت ادیب قرار دیتے ہیں۔ وہ وہاب کی زندگی کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت اور عدم دلچسپی کو ہی اس کی خوش قسمتی مانتا ہے۔ جبکہ فردوسی سے متعلق جانکاری کی افراط و تفریط کو اس کی بد قسمتی بتاتا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ فردوسی کے متعلق جس تذکرہ نگار کے من میں جو آیا۔ لکھ ڈالا۔ یہاں تک کہ ان کی ولدیت، سکونت اور تاریخ ولادت میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ حد تو یہ ہے کہ یہ اختلاف فردوسی کے حالات زندگی تک ہی محدود نہ رہا بلکہ فردوسی کے شاہکار ”شاہنامہ“ میں بھی ان کے جانشینوں نے کھل بھلی کی۔ اسی وجہ سے شاہنامہ کی صحیح ابیات آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔ پروفیسر حاجی ان سبھی باتوں کو مد نظر رکھ کر فردوسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”سوانح نگاروں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ فردوسی ایران کے نام، ولدیت،

سکونت اور تاریخ ولادت میں بھی اختلاف پیدا کر دیا، تاریخ گزیدہ میں نام

حسن بن علی، دولت شاہ کے ہاں نام حسن بن اسحاق، دیباچہ بایسنغری میں منصور احمد اور پروفیسر شیرآئی کے نزدیک ابوالقاسم المنصور الفردوسی۔ جاے ولادت بعض کے نزدیک شاداب اور بعض کے نزدیک ”باڑ“ جو ناحیہ طبران میں واقع تھا۔ اور طبران پر گنہ طوس کا ایک شہر تھا۔ ولادت کی تاریخ کے متعلق علامہ شبلی مرحوم ۳۲۹ھ لکھتے ہیں۔ اور پروفیسر شیرآئی ۳۲۲ھ یا ۳۲۳ھ پر استدلال مضمر ہیں۔“

اب دیکھئے پروفیسر حاجتی وہاب کو کس طرح فردوسی پر سبقت دیتے ہیں۔ وہاب کی خامیوں کو خوبیاں بنا کر پیش کرنے کا یہ سلیقہ شاید ہی کسی اور کو آتا۔ پروفیسر حاجتی اپنے بیان کو استدلال اور جواز کے ساتھ ماننے کیلئے قاری کو مجبور ہی نہیں بلکہ آمادہ بھی کرتا ہے۔ تاریخ کے ساتھ اس طرح کھیلنے کیلئے علمی سرمایہ کا در دست ہونا ضروری ہے۔ اور یہ علمی سرمایہ پروفیسر حاجتی کے پاس تھا۔

”اس کے مقابلے پر فردوسی کشمیر کی سوانح کو آج تک کسی نے چھوا بھی نہیں۔ اور جب کشمیر بزمِ ادب نے اس فروگذاشت کی تلافی کیلئے قدم اٹھایا تو ایک پورا ادارہ وہاب کی حیات کے خط و خال کی تنقید پر مامور اور متوجہ ہوا۔ اس لئے وہاب اس بارے میں فردوسی سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ اس کی ادبی زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کی جانچ پڑتال میں افسانہ نویسی، کذب بیانی اور بے جا مدح و ذم کے امکانات کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔“^۱

اس مضمون میں ادبیاتِ عالم سے متعلق پروفیسر حاجتی کی واقفیت کا بھی برملا اظہار ملتا

ہے۔ فارسی، عربی اور اردو علوم اور تاریخ کا اُن کو گہرا گیان تھا اسی گیان کی بنیاد پر انہوں نے اس قسم کا عمدہ تقابلی مضمون لکھا ہے۔ حالانکہ تقابل کے دوران بھی وہاب کا ذکر زیادہ کیا گیا ہے اور فردوسی کا ذکر صرف اُس وقت کیا گیا ہے جب وہاب کو اُن پر فوقیت دینی مطلوب ہوتی ہے۔

مضمون میں شاہنامہ فردوسی اور شاہنامہ وہاب کا ایک بھرپور تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ وہاب پرے نے کہاں کن اشعار کو چھوڑا ہے۔ اور کہاں کہاں اچھوتی شان پیدا کی ہے۔ ان بھی باتوں کی طرف پروفیسر حاجی نے کامل بصیرت کے ساتھ اشارے کئے ہیں۔

”اس سے ایک ادبی نکتہ مترشح ہوتا ہے وہ یہ کہ فردوسی ایران وطن

پرستی کے ساتھ ساتھ ادب برائے معاوضہ کا بھی قائل تھا اور وہاب

تاریخ شناسی کے ساتھ ساتھ ادب برائے ملت کا دلدادہ“۔^۱

دیوان وہاب میں شامل ہر کوئی شعر یا نظم دوسرے شاعروں کی طرح ادب عالی کا نمونہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں کہ اُن کے پاس کچھ اچھا نہیں۔ بلکہ اُن کے قلم نے بہت سارے ایسے اشعار بھی صفحہ قرطاس پر بچھائے ہیں جو انہیں بلند مرتبت شاعروں کی صف میں کھڑا کرنے کیلئے کافی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے دیوان میں یک رنگی نہیں ہے۔ بلکہ انسانی زندگی کو جتنے رنگ خوبصورت اور دلکش بنا سکتے ہیں وہ سبھی رنگ وہاب کے یہاں موجود ہیں۔

دیوان وہاب کا ایک خاص رنگ صوفیانہ رنگ ہے۔ وہاب پرے دین پرست ہونے کے ساتھ پیرمریدی کے زبردست پیروکار تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ اپنی شاعری کو بھی بزرگان دین اور خدا کی عنایت سمجھتے تھے۔ اسلئے اُن کی شاعری میں متصوفانہ فکر کا ہونا لازمی ہے۔ پروفیسر حاجی کا وہاب پرے کے متعلق اگلا مضمون ”کشمیر کا فردوسی۔ تصوف کی دُنیا

میں۔^۱، گلریز کے مئی ۱۹۵۳ء کے شمارے میں چھپا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے وہاب پرے کے متصوفیانہ فکر کو موضوع بحث بنایا۔ اس مضمون میں واقعی حاجتی صاحب نے اپنی ذہانت اور تخلیقی قوت سے وہاب کے اشعار کی تشریح کر کے اُن کو ایسے رنگوں میں رنگ دیا کہ وہاب پرے نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوگا۔ ایک طرف وہاب کے متصوفیانہ انداز فکر کی وضاحت بڑے مدلل انداز میں کی دوسری طرف وہاب کے اشعار کو تصوف کے پیکر بنا کر انہیں ایک صوفی شاعر ثابت کیا۔ پروفیسر حاجتی تصوف اور علوم عربیہ کے نباض تھے اس لئے انہوں نے وہاب کو بھی اس رنگ میں رنگ دیا۔ حالانکہ خود ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ اصل ہیں وہاب کا تصوف قنوطیت کی پیداوار ہے اور دنیاوی اُتھل پُتھل سے فرار کی راہ ہے۔

”اسی لئے جمالیات سے قطعہ نظر دیوان وہاب یا سیات سے معمور ہے جس کا محور ”غم روزگار“ اور قطبین جبر و قدر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ موخر الذکر کی پیدا کردہ الجھنوں سے تنگ آ کر وہاب علی العموم آب و گل پر کیچڑ اُچھالتا ہے۔۔۔۔۔ آپ اس منہاج تخیل کو فلسفہ فرار کہئے یا آریائی تصور حیات۔ اس کا نام غیر عربی تصوف رکھئے یا ریشیان کشمیر کی پیروی“

وہاب کے فلسفہ تصوف کی طرف مائل ہونے کی وجوہات اور دنیاوی معاملات سے اس کی بے دلی کا اجمالی خاکہ کھینچنے کے بعد پروفیسر حاجتی نے وہاب کے چند اشعار کی شرح کی ہے۔ اشعار کی شرح پڑھنے سے ہم پروفیسر حاجتی کے فلسفہ تصوف اور مشرقی علوم پر اُن کی قدرت کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہوا ایک شعر کی تشریح:

”نیم کشتہ بر سرِ راہ تراؤںس بے حال و ہوش
گاہ زندہ گاہ مردہ خفتہ گاہ بیدار گاہ“

۱ دیوان وہاب ردیف ”الف“

کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر صاحب لکھتے ہیں۔

”شیخ لاشراق علیہ الرحمہ کے نزدیک کائنات فاعلی تنویر کا ایک زبردست عمل ہے۔ جہاں عقلی استدلال زیادہ سے زیادہ ہمیں چند اشارات مہیا کر سکے گا۔ جن کی بناء پر ہم قیاس کر سکیں گے کہ نور اولیٰ کی لامحدودیت کا جزوی اظہار ہی کائنات ہے۔ جس کی تنویر کی مسلسل حرکت کی وجہ عشق کا وہ جذبہ ہے۔ جو مبداء نور سے مستفیض ہونے اور اسی طرف کی لوٹنے پر مضر ہے۔ اس طرح اشراقیین کے نزدیک کائنات محبت کا ایک ابدی ڈرامہ ہے۔ جس میں تجزیہ اور طریبیہ دونوں کے ایکٹریک وقت کا فرما ہیں۔ اسلئے اس انقلابی دور میں جبکہ نور و ظلمت کی توجہ میں وہاب حیران تھا۔ اس کو اپنے وجود میں خواب و بیداری، غم و انبساط، الخضر موت و حیات بیک وقت کا فرما نظر آنے لگے۔“

اس طرح پروفیسر حاجتی نے وہاب کو ایک پورا صوفی شاعر قرار دیا۔ جس نے ایک حسرت آفرین ماحول میں قحط، وباء، طاعون اور سیلاب سے ہزاروں کشمیریوں کو لقمہ اجل بننے دیکھا۔ اس حوصلہ شکن اور رروح فرسا مشاہدہ نے وہاب پر یے کے ذہن کو کُجھن، یاسیت اور قنوطیت پسند بنا ڈالا۔ ان مسائل اور الجھنوں کو ہی پروفیسر حاجتی وہاب کے صوفی شاعر بننے کی وجہ ثابت کرتا ہے۔ کہتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں غیر مہذب حکومت کے جور و ظلم اور کشمیریوں کی عام مفلوک الحالی نے اول ہر کشمیری شاعر کے لئے ایک حسرت آفریں ماحول پیدا کر دیا تھا۔ دوئم ”وہاب نے اپنی زندگی میں کئی بار قحط، وباء، طاعون اور سیلاب سے ہزاروں کشمیریوں کو لقمہ اجل بننے دیکھا اور اس حوصلہ شکن اور رروح فرسا مشاہدہ پر عجمی تصوف اور ایرانی ادبیات نے وہاب کے ذہن کو کوشان کوشان حزن پسندی کا شیدائی بنا ڈالا۔“

ادب تاریخ بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہی ادب پارہ صدیوں کی عمر پاتا ہے جو اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کی تاریخ بھی ہو۔ ہر بڑا ادب پارہ اپنے زمانے کی تاریخی دستاویز ہوتا ہے۔ میر تقی میر کو دلی کا نوحہ گر کہا جاتا ہے۔ غالب کے خطوط غدر کے حالات کے گواہ ہیں۔ گیان چند جین کا ماننا ہے کہ اگر اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی سماجی تاریخ رقم کرنی ہو تو اس کے لئے بنیادی ماخذ کا کام اُس زمانے میں لکھی گئی اردو داستانوں سے زیادہ شاید ہی کوئی دوسری دستاویز کر سکتی ہے۔ میر حسن کی مثنوی ”سحر البیان“ اور ”تسیم کی مثنوی“ گلزارِ تسیم۔ اعلیٰ پایہ کی مثنویاں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے زمانوں کی سماجی تاریخ بھی ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول ”امراؤ جان ادا“ بھی اپنے زمانے اور غدر کے دوران پیش آنے والے حالات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ایک بات طے ہے کہ ایک بڑا شاعر یا ادیب ایک اچھا مورخ بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر حاجی کو اس بات کا گہرا علم تھا کہ اگر شاعر مورخ ہو تو اس کے فن کی چھاپ صدیوں تک رہتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے اب وہاب کی شاعری کو ایک تاریخی دستاویز بنا کر پیش کرنے کی ٹھان لی۔

وہاب پرے کے یہاں بھی تنوع مضامین ہیں جہاں ایک طرف اُس کی شاعری میں قنوطیت اور یاسیت چھائی ہوئی ہے۔ وہی اُن کی شاعری یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہاب ایک بہت بڑے visionary تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں آنے والے زمانے کے متعلق بہت ساری پیشن گوئیاں کی تھیں جو سب اپنے وقت پر صحیح ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ وہاب کی شاعری ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ وہاب پرے کے متعلق حاجی صاحب کا جو آخری مضمون گلریز کے مارچ ۱۹۵۴ء کے شمارے میں چھپا۔ اُس کا عنوان ”وہاب۔ بحیثیت مورخ کشمیر“ تھا۔ اس مضمون میں حاجی صاحب نے وہاب پرے کو ایک مورخ کی حیثیت سے قارئین اور ادب نوازوں کے سامنے پیش کیا۔ پروفیسر حاجی کو اس بات کا اندازہ بخوبی تھا کہ وہاب کو جاودانی عطا کرنے کے لئے اُن کی شاعری میں موجود مختلف عناصر کو ٹٹول کر قارئین کے سامنے لانا ہوگا۔ اسی لئے انہوں نے وہاب کی شاعری میں موجود تاریخی حوالوں اور تاریخی عناصر پر مدلل مضمون لکھا۔

پروفیسر حاجتی کے مطابق وہاب نے اپنی شاعری میں تاریخ کشمیر کے جن ادوار کا ذکر کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

- ۱۔ چک خاندان کا آخری دور۔
 - ۲۔ افغانوں کا آخری دور۔
 - ۳۔ ڈوگرہ شاہی کے ابتدائی ساٹھ سال۔
- پروفیسر حاجتی لکھتے ہیں۔

”وہاب نے اپنی تخلیقات میں تاریخ اسلام اور تاریخ کشمیر کے متعدد ادوار کو بیان کر لیا ہے۔ آج کی قسط میں وہی حصے بیان کئے جائیں گے جو تاریخ کشمیر سے متعلق ہیں

تاریخ کشمیر کے مندرجہ ذیل ابواب پر وہاب نے وضاحت کے ساتھ رائے زنی کی ہیں۔

(۱) چک خاندان کا آخری دور (ب) افغانوں کا آخری دور

(ج) ڈوگرہ شاہی کے ابتدائی آٹھ سال۔“

مضمون میں ان ہی تین عنوانات کے تحت وہاب کی شاعری سے ان ادوار کے متعلق حوالہ جات پیش کرتے ہوئے وہاب کو ایک مورخ ثابت کیا ہے۔ وہاب کی شاعری پر بات کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی تاریخ عالم خصوصاً اسلامی ممالک کے تاریخی المیہ پر کھل کر بات کرتے ہیں۔ مضمون کے پہلے حصے میں چک خاندان کی انتقامی سیاست کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اگر وہاب نے بنظر غائر فرقہ بندی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا۔ تو اس کو یقین آتا کہ عربوں کی قبائلی عصبیت اور ایرانیوں کی جلی قوم پرستی نے جس سیاسی اختلاف کو مذہبی رنگت دے کر شیعہ سنی تازعہ کی طرح ڈالی ہے۔ وہ فی الحقیقت عملی دنیا میں ایک طرف ملّا و مجتہد کے لئے ذرئہ معاش ثابت

ہو گئی۔ اور دوسری طرف وحدتِ اسلامی کی بیخ کنی کی باعث بھی بنی!“

چک دور کے سیاسی انتشار، مسلکی تعصب اور کھلبلی کو وہاب نے اپنی شہرہ آفاق عقیدتی تصنیف ”سلطانی“ میں بیان کیا ہے۔ ”سلطانی“ حضرت سلطان العارفینؒ کی منظوم سوانح ہے۔ چونکہ وہاب پرے کو حضرت سلطان العارفینؒ کے ساتھ بے پناہ عقیدت تھی اور انہوں نے یہ ترجمہ اسی عقیدت کی بنیاد پر کیا۔ اس لئے انہوں اس زمانے کے سیاسی اور مسلکی حالات کو بھی اپنے ہی اعتقاد کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ اسی کوشش کے نتیجے میں وہ جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چک خاندان کے ظلم و جفا کو شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس جانبداری کے متعلق پروفیسر حاجتی رقمطراز ہیں۔

”سلطانی چونکہ شیخ حمزہ مخدومؒ کے پانچ خلفاء کی نگارشات کا ترجمہ ہے۔ اس لئے وہاب نے بحیثیت مترجم حق تو ادا کر دیا، لیکن بحیثیت مورخ غیر جانبدار نہ رہ سکا۔ اور اپنے معتقدات کی کسوٹی پر دوسروں کو پرکھنے لگا۔“

مضمون کے دوسرے حصے میں کشمیر میں افغانیوں کے ظلم و ستم کی کہانی اور اس دور میں کشمیر کے سیاسی انتشار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس دور کے حالات کا بیان وہاب نے ”اکبر نامہ“ میں کیا ہے۔ ”اکبر نامہ“ پر بات کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی نے افغانوں اور سکھوں کے تنازعات اور ان دونوں کے ذریعے کشمیر پر کئے گئے ظلم کی کہانی کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

”افغانوں کے عہد میں کشمیر کا مجموعی طور وہی حال ہوا۔ جو دکن میں مرہٹوں کے عہد میں تھا۔“

اس مضمون کے آخری حصے میں ڈوگرہ تسلط کی روئداد بیان کی گئی ہے۔ یہ زمانہ وہاب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بلکہ اس زمانے میں وہاب خود کئی عہدوں پر فائز رہا۔ پروفیسر حاجتی اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

”وہابؔ خود اس زمانے کے اکثر دیہاتی منصوبوں مثلاً حلقہ دار، کاردار، تحویل دار اور نائب تحصیلدار کی لطافت یا کثافت کا تجربہ کر چکا تھا۔ اس لئے عوام کی بد حالی بالخصوص مزارعین کی تباہ حالی سے اس کو پوری واقفیت تھی۔ اور اس بارے میں اس سے زیادہ صاف گو مورخ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اور اس کا چشم دید بیان کسی شرح کا محتاج دکھائی نہیں دیتا۔“

اس مضمون کو پڑھنے کے بعد قاری کو ایک حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف پروفیسر حاجتی نے وہابؔ پرے کو ایک مورخ کشمیر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ویسی یہ بات صاف سامنے آئی ہے کہ حاجتی صاحب خود بھی ایک ذی حس تاریخ دان تھے۔ انہوں نے جس انداز سے کشمیر کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ اُسے ہٹری پر اُن کی مضبوط گرفت اور ان کے تاریخی شعور کا بھرپور انداز ہوتا ہے۔

اس طرح پروفیسر محی الدین حاجتی نے وہابؔ پرے کو جہاں ایک طرف ”فردوسی کشمیر“ قرار دے کر ادب کی بہت بڑی خدمت کی۔ وہی دوسری طرف انہیں تصوف کے رنگ میں رنگ کر اپنے اور وہابؔ پرے کے عقیدے سے بھی انصاف کیا۔ اور آخر پر انہیں ایک مورخ ثابت کر کے اُنکی شاعری کو تاریخ بنا کر وہابؔ کے نام کو بلند یوں پر پہنچا دیا۔ یہ صرف پروفیسر حاجتی صاحب کی ہی بدولت ہے کہ آج وہابؔ پرے کو مقبول کرا لہ واری، محمود گامی اور شمس فقیر کے ساتھ ساتھ کھن اور حسن شاہ کھو بیہامی کی صفوں میں یکساں درجہ حاصل ہے۔ لیکن ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں حاجتی صاحب کے یہ مضامین ادب عالی کے نمونے ہیں وہی یہ کہ ان میں عقیدت کا عنصر غالب دیکھنے کو ملتا ہے۔ پروفیسر حاجتی اول سے آخر تک وہابؔ کو ایک عظیم شاعر کی صورت میں پیش کرنے کی دھن میں مگن رہے۔ اسی دھن

میں وہ اُن کی شاعری کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنا بھول گئے۔ ان مضامین میں پروفیسر حاجتی نے ملی جلی زبان استعمال کی ہے۔ کئی پر خالص علمی اور عالمانہ زبان اور کئی کئی عام فہم اور عوامی زبان کا استعمال کیا ہے۔

پروفیسر حاجتی صاحب کے ان مضامین نے علمی و ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ اب تک لوگوں کو وہاب کے بارے میں زیادہ معلوم نہ تھا اور نہ ہی انہیں حاجتی صاحب کی اس قدر گہری علمی بصیرت اور تنقیدی نظر کا اندازہ تھا۔ ان مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد امین بچھ لکھتے ہیں۔

”شاعر وہاب اور اس پر لکھنے والا پروفیسر حاجتی جیسا ابوالقلم جس نے وہاب کا تعارف دنیا کے ساتھ اس طرح کرنا شروع کیا ہے کہ وہاب کی شاعری ادیبوں کی توجہ اپنی طرف بڑے شد و مد سے کھینچنے لگی ہے۔ وہاب کی عظمت سے کسی کو شک کرنے کی مجال ہو ہی نہیں سکتی اور اس کا سہرا پروفیسر موصوف کے سر ہے۔“^۱

ان مضامین کے شائع ہونے کے بعد وہاب سے متعلق ادبی حلقوں میں سنجیدگی پیدا ہوئی۔ اُن کے کلام کو پرکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہاب پرے اچانک محققین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اب اُن کے متعلق لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ حلقہ ادب سوناواری حاجن نے اپنے ترجمان رسالے ”دولر کی ملر“ کا وہاب نمبر شائع کیا۔ ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی کے لئے موتی لال ساہتی نے وہاب کا مونوگراف ”ہندوستانی ادب کے معمار“ سیریز کے تحت تیار کیا۔

گلبرز سالنامہ ستمبر اکتوبر ۱۹۵۳ء

۱

اور بھی بہت سارے اداروں نے وہاب پرے کی زندگی اور اُن کی ادبی خدمات سے متعلق خصوصی نمبرات اور شمارے شائع کئے۔ ایک بات جو مشترک ہے وہ یہ کہ ان سب رسائل اور جرائد کیلئے بنیادی ماخذ پروفیسر حاجتی کے ہی مضامین رہے۔

پروفیسر حاجتی کا وہاب پرے کی حیات اور ادبی کارناموں پر اس طرح قلم اٹھانا اصل میں ایک تحریک کا حصہ ہے۔ وہ کشمیریوں کو اپنے شاندار ماضی اور اسلاف کی جانکاری دینا چاہتے تھے، جس کے لئے انہوں نے وہاب کو ایک محرک کے طور پر استعمال کیا۔ اُن کی اس سوچ کے بارے میں پروفیسر شفیع شوق لکھتے ہیں:

”کشمیریوں کی غلامی کا آغاز مغلوں کی آمد سے ہوا اور وہ اس غلامی کا سب سے بڑا سبب کشمیری مسلمانوں کی ذہنی پڑمردگی اور اپنے ماضی سے غفلت سمجھتے تھے۔ لہذا انہوں نے کشمیریوں کی زبان، ان کے ادب اور ان کی ثقافت کی افہام و تفہیم کے لئے ان تھک کوشش کی۔ ان سب معاملوں پر ان کا اپنا مخصوص نظریہ تھا اور وہ اس سے بدلنے کے لئے تیار نہ تھے۔“

کشمیری زبان و ادب کے ساتھ اسی بنیاد پر حاجتی صاحب کی زبردست وابستگی تھی۔ وہ سوتے جاگتے اس زبان کے بارے میں سوچتے تھے۔ اُن کے اہم جلیس معراج الدین بازیافت ۱۹۵۳ء کے ”گوشہ حاجتی“ میں لکھتے ہیں:

۱۔ بازیافت ”گوشہ حاجتی“ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

”کشمیری زبان و ادب کے تئیں اُن کی خدمت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ بات میں اُن کے بطور ادیب نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ عملی میدان میں انہوں نے اس بد نصیب قوم کی زبان کی ترقی و ترویج کے لئے انتھک کام کیا۔“

میری نظر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مضامین کو ایک کتابی صورت میں شائع کیا جانا چاہیے، وہ پروفیسر حاجتی اور وہاب پرے کے لئے سب سے بڑا خراج ہوگا۔ ساتھ ہی کشمیری ادب کی ایک بہت بڑی خدمت بھی ہوتی۔



کلام دیگرے

پروفیسر محی الدین حاجتی کشمیر کے دانشوروں اور اپنے ہم عصر مفکروں اور ادیبوں کی صف میں مانند خورشید نظر آتے ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری زبان کی تحریک کو اردو میں بھی آگے بڑھایا۔ انہوں نے اردو میں جتنے بھی مضامین لکھیں۔ ان میں انہوں نے زیادہ تر میں کشمیری شعراء کی زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ اسکے علاوہ کشمیری لوک ادب بھی اُن کی دلچسپی کا میدان رہا ہے۔ اُن کا ماننا تھا کہ لسانی اور ثقافتی طور سے وہی قوم صحت مند اور زندہ رہتی ہے جس قوم کے لوک ادب کی روایت صحت اور مند مضبوط ہو۔ اس لئے انہوں نے جس زبان میں بھی لکھا، کشمیری لوک ادب کی تاریخ کو ضرور ٹٹولا۔ وہ اب پرے کے بعد محی الدین حاجتی نے ”مولوی صدیق اللہ حاجتی“ کی حیات اور ادبی کارناموں پر ایک مفصل مضمون رقم کیا۔ اس مضمون کے علاوہ محی الدین حاجتی نے ”کشمیری لوک ادب کا خاکہ“ مضمون لکھ کر کشمیری لوک ادب کی روایات کا مدلل خاکہ پیش کیا۔

”ابتدائی ریشی سلسلے کا ایک تاریخ جائزہ“ اور ”کشمیری ادب کی چند تاریخی تلمیحات“ کے عنوان سے مضامین لکھ کر پروفیسر حاجتی نے کشمیری تہذیب و ثقافت کی خدمت کرنے کے علاوہ کشمیر کے دامن اردو میں نگینے جڑ کر ایک بہت بڑا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ حاجتی صاحب نے کشمیر کے سائنٹفک (Scientific) ادیب مرزا غلام حسن بیگ عارف کی ایک رباعی کی تشریح ”آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی“ کے عنوان سے کر کے مرزا عارف کو ایک بڑا ادیب بنا کر پیش کیا۔ منصور جس کی تصنیف ”کتاب الطواصین“ کا حاجتی صاحب نے اردو میں شرح لکھا تھا، اور اقبال جو کہ برصغیر ہندوپاک کے سب سے بڑے دانشور شاعر ہیں، کا ایک تقابلی مطالعہ بھی پروفیسر حاجتی نے پیش کیا۔ یہ مضمون ”اقبال اور حلاج“ کے عنوان سے ”محفل اقبال“ میں شائع ہوا۔ اب پیش ہیں ان مضامین کے ایک مختصر جائزے۔

مولوی صدیق اللہ حاجتی

حاجن کے ادبی آسمان کے درخشندہ ستاروں میں ایک ستارہ ”مولوی صدیق اللہ حاجتی“ ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجن کے ایک معزز اور پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مولوی صدیق اللہ حاجتی ایک باوقار روحانی بزرگ تھے۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس اپنی مرادیں لے کر آتے اور ان کے دربار سے فیض یاب ہوتے تھے۔ پیر مریدی اُن کے خاندان میں صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجن کے روحانی بزرگوں کی صف میں دیو قامت نظر آتے ہیں۔ ایک باکمال روحانی بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک معتبر سخن ور اور عالم دین تھے۔

اگرچہ مولوی صدیق اللہ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۵ شعبان المعظم ۱۳۱۸ھ کو انتقال کر گئے۔ لیکن پروفیسر محی الدین حاجتی کے قلم اٹھانے تک اُن کی زندگی پردہ راز میں ہی تھی۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء کے ”گلریز“ کے سالنامے میں پروفیسر محی الدین حاجتی کا ”مولوی صدیق اللہ حاجتی“ کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے مولوی صدیق اللہ کے حالات زندگی کی آڑ میں کشمیر کی اقتصادی اور سیاسی بد حالی کے علاوہ جاگیر دارنہ ظلم و ستم کی ایسی تصویریں کھینچی ہے کہ پڑھنے سے قاری کے دل میں شدت جذبات اور احساس سے خوف پیدا ہوتا ہے۔

محی الدین حاجتی ایک سچے کشمیری تھے۔ کشمیر کی محبت اُن کے ریشے ریشے میں تھی۔ وہ کشمیری قوم کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ذکر چاہیے کسی شاعر کی زندگی کا ہو رہا ہو یا کسی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا ہو۔ کشمیر کی قسمت پر حاجتی ہر جگہ ماتم کرتے ہوئے نظر

آتے ہیں۔ چونکہ جس ماحول میں مولوی صدیق اللہ نے آنکھیں کھولیں، وہ ماحول کسی بھی لحاظ سے کشمیر اور کشمیریوں کیلئے اطمینان بخش نہ تھا۔ اس مضمون کی ابتداء پروفیسر حاجتی کشمیر کی قسمت کا نوہ لکھتے ہوئے اس طرح کرتے ہیں۔

”کشمیر کی یہ بدبختی بہت دیرینہ ہے کہ اسکی قسمت کا فیصلہ اس کی حدود سے باہر کیا جاتا ہے۔ فیصلہ کرنے والے بالعموم غیر کشمیری ہوتے ہیں اور جب کسی شاہانہ فیصلہ کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ تو اس عزم و قوت کے ساتھ اس پر کاروائی شروع ہوتی ہے۔ گویا ہر کشمیری نے ”بحواس خمسہ“ بلا کسی جبر و اکراہ“ اس فیصلے کے کارپردازوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔“^۱

چونکہ تیرہویں صدی ہجری سیاسی، اقتصادی اور معاشی لحاظ سے کشمیر کیلئے آفتوں کی صدی تھی۔ اس لئے اس صدی کی ہر کوئی کہانی دل آزار ہے۔ پہلے سکھوں کی حکومت میں عام لوگوں پر ظلم و جبر کی یہ حد کہ لوگ نان شبینہ کے محتاج ہو گئے، اس کے بعد شیر سنگھ کا قحط۔ پھر کشمیریوں کو بھپنے اور خریدنے کا عمل، ان آفات نے کشمیریوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ انہی روح فرسا حالات میں مولوی صدیق اللہ نے جنم لیا اور جوان ہوئے۔ یہ بات عیاں ہے کہ صدیق اللہ کے والد مولوی عبدالفتاح کو ان کی پرورش کرنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس زمانے میں بقول مصنف تاریخ جدولی ”دوسر چاول ایک روپیہ میں بھی نہ ملتے تھے اور ایک روپیہ کسی کے پاس تھا ہی نہیں“، تو مولوی عبدالفتاح کے گھر کا گزارہ کیسے چلا ہوگا، سوچنا بھی مشکل ہے۔ لیکن اپنے ابتدائی زمانے کے ان حالات کا ذکر نہ ہی بعد میں عالم و

گلریز سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۴ء

۱

فاضل مولوی صدیق اللہ نے کہی کیا ہے اور نہ ہی کسی اور نے اس بارے میں کچھ لکھا ہے۔
 پروفیسر حاجتی جس نے وہاب پرے کی زندگی کے حالات کرید کرید بزرگوں سے حاصل کئے،
 صدیق اللہ کے متعلق جانکاری حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

”حاجن میں سبز قدم خوشحال سنگھ کے کارندوں نے وہ تباہی مچادی کہ نماز جمعہ کی جماعت بھی نہ ہو سکی۔ امام مسجد شیخ جمیل برادر شیخ عبدالفتاح تارہ زوہ بھاگا۔ اور مقتدی معاش کی تلاش میں اس قدر پریشان ہو گئے کہ مسجد ہی بے چراغ رہی۔ عوام کا جب یہ حال ہو تو عبدالفتاح وعظ خوانی سے کیا پاتے کہ صدیق اللہ کی تربیت پر خرچ کرتے۔ اس ذلیل عہد میں کسی کے ہاں بچہ پیدا ہونا یا پیدا ہو کر اس کا بچنا معجزہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے صدیق اللہ کی زندگی کے ابتدائی چودہ پندرہ سال سے متعلق کوئی معلومات حاصل نہ کی جاسکی۔۔۔۔۔ اقتصادِ بد حالی کا یہ زمانہ اس قدر خوف آفریں تھا کہ بالغ ہو کر بھی مولوی صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کی دردناک داستان کو قلم بند نہیں کر دیا۔“

اس مضمون کے پہلے حصے میں پروفیسر حاجتی نے مولوی صدیق اللہ کی زندگی کی آڑ میں کشمیر کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا بے باک ہو کر تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے مولوی صدیق اللہ کی زندگی سے زیادہ کشمیر کی بد حالی کا رونا رویا ہے۔ اس طرح مولوی صدیق اللہ کی حیات کا تذکرہ کرتے ہوئے محی الدین حاجتی نے کشمیر کی تاریخ کے اوراق الٹنے کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کی بے بسی اور لا چاری پر مرثیہ کیا ہے۔

اس مضمون کے دوسرے حصے میں پروفیسر حاجتی نے مولوی صدیق اللہ حاجتی کی

تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجتی کی تمام تخلیقات مذہبی نقطہ نظر کی حامل ہے۔ انہوں نے کشمیری شعر و ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے۔ اُن کی تخلیقات میں (۱) سکندر نامہ (۲) مغازی النبیؐ (۳) الفرائض المنظوم (۴) و مایا (۵) نجوم الشہابیہ رجوم للوہابیہ (۶) شکل و شمائل آنحضرتؐ (۷) بدائع المنظوم (۸) معجزات رسول (۹) انہار ارباب (۱۰) عقائد ہیں۔

چونکہ صدیق اللہ ایک مذہبی عالم تھے اور پوری زندگی وہ وعظ و تبلیغ کرتے رہے۔ اس لئے اُن کی تخلیقات بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ ان تخلیقات کے مطالعہ کے بعد آسانی سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ صدیق اللہ نے جو کچھ بھی لکھا خالص اس بنیاد پر لکھا کہ دین کے معاملات، فقہی مسائل اور سیرت رسول ﷺ عام لوگوں کے ذہن میں صحیح صورت میں اترے۔ چونکہ اس زمانے میں لوگ شعر و شاعری کے زبردست دلدادہ تھے اس لئے انہوں نے شاعری کا ہی وسیلہ اختیار کیا۔ پروفیسر حاجتی صاحب نے ان تخلیقات پر مختصر لیکن پر مغز تبصرہ کیا ہے۔ اُن کے اس مضمون کو پڑھ کر انسان کی سوچ کبھی بھی جائے لیکن آخر پر لوٹ کر پروفیسر حاجتی کی عالمانہ بصیرت ہی سوچ پر چھا جاتی ہے۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی نے کشمیریوں کی توہم پرستی اور سماج میں موجود رسومات بدکا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ قاری جیسے اُس توہم پرستی اور رسومات یا یوں کہئے ملاؤں کے استحصال کی دُنیا میں خود بخود پہنچ جاتا ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجتی کی تخلیق ”الفرائض المنظوم“ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ کشمیریوں کی توہم پرستی اور یہاں پنپ رہی رسومات کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

”اگر اس زمانے میں کسی مسلمان کے ہاں میت ہوتی۔ تو ملا کے نام روز

چہارم کی فاتح خوانی کے ساتھ ایک ڈنڈا، ایک پکھر (پاپوش کاہ) ایک پوٹلی ”یاچہ“ (کشمیری طرز کے پکوڑے) ایک سوئی اور دھاگے کا گٹا اس دعویٰ پر واجب الادا تھے کہ میت کو ”کاجی ڈاری“ نامی ایک پہاڑی کو پار کرنا تھا۔ اور یہ چیزیں کوہ پیما کی کٹھن منزل میں مردہ کو زندہ رکھتیں تھیں۔ جس جگہ میت کو غسلِ آخر دیا جاتا۔ وہاں کئی روز چراغ جلانا پڑتا۔ مقبرہ پر اپنے چہیتے رشتہ داروں میں سے کسی ایک کو دن رات کئی روز تک پہرہ دینا پڑتا۔

اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے مولوی صدیق اللہ کے فن یا اُن کی ترجمہ کاری پر بات کرنے سے زیادہ کشمیر اور کشمیریوں کی کشمیری کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی یہاں کے لوگوں کے غلط عقائد، رسوماتِ بد، توہمات اور لاعلمی کو بھی دل کھول کر کوسا ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجتی نے اپنی اکثر تصنیفات میں کشمیریوں کے غلط عقائد، توہم پرستی، فقہی انتشار اور لاعلمی کا تذکرہ کیا ہے شاید اسی لئے پروفیسر حاجتی نے بھی ان چیزوں پر دل کھول قلم اٹھایا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے جہاں کشمیری تاریخ کے بھیا نک مناظر کو پیش کر کے قارئین کو چونکا دیا ہے وہی ایک گمنام شاعر کو بھی دنیائے ادب میں صرف زندہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کا قد بھی مقرر کیا اور شاید ہی آج تک کشمیر کا کوئی مذہبی شاعر اُن کے قد کو پہنچ سکا ہے۔ مولوی صاحب کی مشہور ترجمہ ”نجوم الشہابیہ، رجوم اللوہابیہ“ پر تبصرہ کرتے پروفیسر حاجتی مولوی صاحب کو اس طرح عظمت کی سند عطا کرتے ہیں۔

” ہر شعر کی سند میں کلام اللہ کی کوئی نہ کوئی آیت یا حدیثِ نبوی ﷺ یا

قولِ امام حواشی پر درج ہے جن کے ساتھ ساتھ مطالعہ سے شعر کا مفہوم ذہن میں پورا اُترتا ہے“

مولوی صاحب کی ایک عقیدتی اور مذہبی تخلیق ”شکل و شائلِ آنحضرت ﷺ“ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی اُن کی فنی مہارت کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں۔

”مولوی صاحب چونکہ شعر سے زیادہ شرع کے دلدادہ تھے اس لئے نفس مضمون سے متعلقہ احادیث کو اس صنفِ شعر میں ادا کر دیا۔ جس میں تکلف سے بہت کم کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ شاعرانہ تقاضوں کے باوجود انتہائی احتیاط کے ساتھ حلیہ مبارک کو پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ عقیدت یا شاعری واقعات پر غالب نہ آسکیں۔ سخن وری کی پوری رعایت کے باوجود اس مقدس موضوع کو شاید اس سے سادہ تر زبان میں ادا کرنا ممکن نہ تھا“

اس مضمون میں ایک اہم چیز دیکھنے کو ملتی ہے، وہ یہ کہ پروفیسر حاجتی نے مولوی صاحب کی تخلیقات کا تجزیہ یا تقابل کرتے وقت ان کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے، جو کہ وہاب پرے سے متعلق لکھے گئے مضامین میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ جہاں پر بھی پروفیسر حاجتی کو کوئی خامی نظر آئی اس کا اظہار انہوں نے برملا کیا ہے۔ حالانکہ مولوی صاحب کے معاملے میں ایک مشکل یہ تھی ان کے موضوعات مذہبی ہے اور ان میں خامیاں نکالنا بہت ہی کٹھن اور مشکل کام تھا۔ لیکن حاجتی صاحب اس کٹھن منزل کو اپنے علم کے بل پر بڑے آرام سے پار کرتے ہیں۔ یہ دیکھئے مولوی صاحب کی تخلیق ”مغازی النبی“ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی کس طرح اس تصنیف کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

”اگر مولوی صاحب کفار کی ہزیمت کے وقت ذرا غور کرتے اور نتائج کو پرکھتے تو اُن کو غزوات النبیؐ کی تہہ میں ایک ایسا انقلاب نظر آتا جس نے گذشتہ تیرہ صدیوں میں عالمِ اسلام کے سہارے کا کام دیا ہے۔ وہی یہ کہ رسول اللہ ﷺ زندگی کے ہر موڑ پر رحمۃ اللعالمینؐ ہیں، خواہ وہ میدانِ کارزار ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے آنحضرت ﷺ رحمۃ اللعالمین کے بجائے ایک عظیم فاتح نظر آتے ہیں۔ حالانکہ معاندین اسلام تک کو یہ اعتراف ہے کہ انہوں نے جو جنگیں لڑیں ان میں سے اکثر مدافعتی تھیں“

اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے عام فہم زبان اور اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہ مضمون حقیقی معنوں میں اپنے اندر تاریخ، تحقیق اور تنقید کے امتزاج کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس مضمون سے پروفیسر حاجتی کی علمی بالیدگی اور اسلامی تاریخ اور دوسرے علوم پر اُن کی دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مولوی صدیق اللہ حاجتی کے متعلق پروفیسر حاجتی نے اُس قسم کی دلچسپی نہیں دکھائی جو انہوں نے وہاب پرے کے متعلق دکھائی ہے۔ وہاب کے موضوعات کا انہوں نے الگ الگ مطالعہ پیش کیا جبکہ صدیق اللہ کی تمام تصنیفات کو ایک ہی مضمون میں سمیٹا ہے۔ ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ اُن کی تصنیفات کا جائزہ الگ الگ عنوانات کے تحت الگ الگ مضامین میں لیا جاتا۔ اس سے ایک تو پروفیسر حاجتی کو اپنے علمی دریچوں کو دکھانے کا موقع ملتا، دوئم مولوی صدیق اللہ کے ساتھ اور ان کی گراں قدر تصانیف کے ساتھ بھی انصاف ہوتا۔ چونکہ حاجتی صاحب لا اُبالی طبیعت کے مالک تھے اور یکسوئی کے ساتھ کوئی ایک کام نہیں کرتے تھے اس لئے یہاں بھی انہوں نے وہی سرسری انداز اختیار کیا ہے۔

اس مضمون کے بعد مولوی صدیق اللہ کی حیات اور ادبی کارناموں سے متعلق پروفیسر حاجتی نے دو اور مضامین لکھے۔ ایک مضمون کا عنوان ”مولوی صدیق اللہ بحیثیت مبلغ تہذیبی شاعر“ ہے اور یہ مضمون حلقہ ادب کے ترجمان رسالہ ”ولر کی لمر“ میں ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ جبکہ اُن کی حیات اور شاعرانہ خوبیوں سے متعلق ایک مفصل مقالہ ”کلیات صدیق اللہ“ میں ۱۹۸۰ء میں تقریظ کے طور پر شامل ہوا۔ ان مضامین میں پروفیسر حاجتی نے پوری طرح مولوی صدیق اللہ حاجتی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔



کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ

لوک ادب کسی قوم یا کسی عوامی گروہ کی مشترکہ ثقافت کے اجتماعی اظہار کا نام ہے۔ اس کے دائرے میں اس قوم یا گروہ سے وابستہ رسم و رواج، عقائد، مفروضات، توہمات وغیرہ سے متعلق زبانی یا سینہ بہ سینہ چلنے والی کہانیاں، گیت، کہاوتیں اور مذاق کی باتیں شامل ہیں۔ کسی قوم کی تاریخ اور اُس قوم کی ذہنی ارتقاء کا جائزہ لینے کیلئے یہ بات ضروری ہے، کہ اُس قوم کے لوک ادب کے بارے میں جانکاری ہو۔ کیونکہ تاریخی اور ذہنی نشوونما کو سمجھنے میں لوک ادب مدد بھی دیتا ہے اور قوم کی ذہنی ارتقاء کی تہذیب و تنظیم بھی کرتا ہے۔

لوک ادب اُس وسیع اور بیکراں انسانی اثاثے کا ایک حصہ ہے۔ جس کے لئے انگریزی میں Folk Lore کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ Folk Lore کی وسیع اصطلاح ۱۸۴۶ء میں ایک انگریز دولیم جان تھامس، نے وضع کی۔ تھامس قدیم علوم کے ماہر جانے جاتے تھے۔ لوک ادب کو زبانی ادب - Oral Literature، بھی کہا جاتا ہے جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے اور جس میں ہماری بولتی تاریخ محفوظ ہے۔ لوک ادب ہماری روایتی تہذیبی قدروں کا آئینہ ہی نہیں بلکہ نگہبان بھی ہے۔

اپنی جبلی ضرورتوں کے پیش نظر انسان نے قصے کہانیاں سنی اور سنانی شروع کی۔ ان قصہ کہانیوں میں اساطیری اور دیومالائی دنیا آباد کر کے محیر العقول کردار تخلیق کئے۔ وہ کہانیاں

اور کردار، وہ قصے اور واقعات کہ سن کر انسان کے کہیں رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہیں دیکھ کر حیرت سے منہ کھلا رہ جاتا ہے۔ دینا کے مختلف قوموں کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ رستم و سہراب، لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، ہیمال ناگرائے، یزدان و اہرمن، جولیٹ و رومیو، نیکی و بدی کے حاصل اساطیری کرداروں کی توضیح جداگانہ ہوتے ہوئے بھی کس قدر ملتی جلتی ہے۔ اس سے ایک بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ انسان زمین کے کسی بھی کونے میں آباد ہو، ان کی سوچ میں کہی نہ کہی یکسانیت ضرور ہوتی ہے۔ انسانی شعور کی اس قدر کی بے پناہ تخلیقی قوتوں کو دیکھ کر عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ ہم ان ہی روایتی تخلیق سرچشموں سے محفوظ بھی ہوتے ہیں اور فیضان بھی حاصل کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن اپنی اساس ان ہی بنیادوں پر کھڑا کرتی ہے اور یہی روایتی قدریں بعد میں ہماری ثقافت اور تمدن کا روپ دھار لیتی ہے۔ یہی سینہ بہ سینہ یا زبانی چلنے والی قدریں Folk Lore، لوک ادب کہلاتی ہیں۔

لوک ادب کا مطالعہ سماجیات، نسلیات، لسانیات، قوموں کے تہذیبی لین دین اور اس نوع کی دوسری چیزوں کو سمجھنے اور تاریخی ارتقاء کی گریہیں کھولنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کشمیری لوک ادب کے ذریعے ان ہی چیزوں کو سمجھنے کیلئے ریاستی کلچرل اکیڈمی نے ”ہمارا ادب“ کا ”لوک ادب نمبر“ ۷۷-۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔ اس شمارے میں سب سے پہلا مضمون پروفیسر محی الدین حاجتی کا ”کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ حاجتی صاحب لوک ادب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

”کسی قوم کی ادبی تاریخ کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ہی ہمیں اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے ادب میں کچھ ایسی ادبی روایتیں (جنہیں ہم ادبی سرمایہ بھی کہہ سکتے ہیں) موجود ہیں جو متواتر

زبانی اور سینہ بہ سینہ چلتی آئی ہیں۔ اور لوگ خواب و خیال کی دُنیا میں سانس لینے کے خاطر اکثر اسی روایتی دُنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ نثر ہو یا نظم، اس صنفِ سخن میں رہنے سہنے سے لے کر ان کے ارمانوں کی دُنیا تک اس کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اور اس طرح پہلی ہی نظر میں یہ دوسرے اصناف سے الگ دکھائی پڑتی ہے۔ اگر اس صنفِ سخن کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو کسی خاص قوم کی ابتدائی تاریخ سے لے کر ان کے اجتماعی شعور کے خاکوں تک ہر چیز سانس لینے لگتی ہے۔ ادب کی یہی صنف لوک ادب کہلائی جاتی ہے۔“

اپنے فرصت کے لمحات کو خوشی خوشی کاٹنے کے لئے انسان نے قصہ پیدا کیا۔ دن کا تھکا ہارا انسان، جب رات کو گھر پہنچتا تو کسی بھی حالت میں یاروں دوستوں یا پھر ہمسائیوں کی محفل میں جاتا، وہاں اپنی کہتا اور دوسروں کی سُنتا۔ ہر کوئی کہنے والا چاہتا تھا کہ توجہ کا مرکز بنا رہے۔ اسی رجحان نے قصے کو جنم دیا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے جو قصہ عصری تقاضوں کو پورا کرتا وہی قصہ زیادہ ترقی کرتا۔ ان قصوں میں اُن قوموں کی تاریخ ہوتی اور اُن کے جینے کے رویے ہوتے تھے۔ ان قصوں میں تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی بوباس ہوتی تھی۔ خیر آج کا سائنسی دور ان باتوں کی فرصت نہیں دیتا۔ لیکن آج بھی اُن زمانوں کو سمجھنے کیلئے یہ قصے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ قصے زیادہ تر سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے اور یہی قصے اصل میں لوک ادب ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف رجحانات نے قصوں میں راہ پائی۔ لیکن زیادہ تر قصوں میں مافوق الفطری اور اساطیری عناصر ہی چھائے رہے۔ محیرِ عقل کردار ہمیشہ انسان کی ذہنی تسکین کرتے تھے۔ یہی کردار آج اساطیری کردار کہلاتے ہیں۔ کشمیری نثری لوک ادب کو مختلف ادوار میں کن رجحانات نے متاثر کیا؟ پروفیسر حاجتی اس بارے میں رقمطراز ہیں۔

”یہ باطنیت کے اسی رجحان کا اعجاز تھا کہ ہمارے ادب میں دیو مالائی عنصر ایک طرف سے اور فلسفہ دوسری جانب سے داخل ہوا۔ جس نے کبھی جادو، کبھی تو ہم پرستی اور کبھی دوسرے ایسے ہی عناصر کا روپ دھار لیا۔ مختلف جہتوں نے مل کر، یکسر ہمارے لوک ادب کو مافوق الطبیعی مزاج بخش دیا۔“

اس مضمون میں آگے چل کر پروفیسر حاجتی صاحب اُن تمام حالات و واقعات اور رجحانات و محرکات کا ذکر بڑے دلکش اور مورخانہ انداز میں کرتے ہیں، جنہوں نے وقتاً فوقتاً کشمیری لوک ادب کو اپنے سائیوں میں لپیٹ کر اسکی تہذیب بھی کی اور اس کا رخ متعین کرنے کی کوشش بھی کی۔ کشمیری قوم کی اپنی روایات، پھر بودھ مت کے زیر اثر لوک ادب میں بدلاؤ، مغلوں کی ہندوستان آمد اور اسلام کے اثر کے ساتھ ایرانی علوم کی کارفرمائیوں سے لوک ادب کی نئی جہتوں کا سامنے آنا، پھر سکھوں اور ڈوگروں کے دور میں کشمیریوں کا ظلم و جبر سے تنگ آ کر تصوراتی دنیا کی تعمیر میں مصروف رہنا۔ اسی طرح کشمیری لوک ادب میں رائج مختلف تلمیحات اور کشمیر کے لوک ادب میں پہیلیوں کا مقام، ان بھی امور پر پروفیسر حاجتی نے سیر حاصل تبصرہ کر کے حقائق کی گرہیں کھول دی ہیں۔ ایرانی علوم اور ادب کے زیر اثر کشمیری لوک ادب میں ہوئی تبدیلیوں کا تذکرہ پروفیسر حاجتی نے اس طرح کیا ہے۔

”ایسی بن کھلی آرزوؤں پر ایرانی ادبیات نے نازک پچکاری کا کام کر لیا، جس کی جلو میں لوک ادب کا جناتی تصور روز بروز بڑھتا ہی رہا۔ چنانچہ آج بھی

زبانوں میں عقل و فراست کی اتنی کہاوتیں محفوظ ہوں گی جتنی کہ کشمیری زبان میں ہیں۔“

اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے سادہ اور آسان زبان استعمال کی ہے۔ زبان میں کوئی لوج اور الجھاؤ نہیں ہے۔ زبان موضوع کی مناسبت سے استعمال کی گئی ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجتی نے موضوع کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ اسی عنوان کے تحت پروفیسر حاجتی نے انگریزی میں ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ وہ مقالہ بنیادی طور پر ”پرتاب“ میگزین میں شائع ہوا تھا اور اس کو ۲۰۱۵ء میں حلقہ ادب سوناواری کی طرف سے چھاپی گئی Discourses of Prof. Mohi U Din Hajini نامی کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔ کشمیری زبان میں بھی اس موضوع پر اُن کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔



علامہ اقبالؒ اور حلاج

پروفیسر حاجتی اصل میں عربی کے عالم تھے۔ عربی انہوں نے درس پڑھی تھی۔ کشمیری زبان کی لسانی تحریک کے روح رواں تھے۔ انگریزی پر اُن کو ماہرانہ دسترس تھی اور اردو سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان تمام زبانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس بھی زبان میں انہوں نے قلم اٹھایا، قطروں کو قلمزم بنا دیا اور فصاحت وہ زبان و بیان میں تلاطم پیدا کر دیا۔ یہ کمال ہر ادیب کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔

حلاج کے بارے میں پروفیسر حاجتی نے ابتدائی جانکاری کشمیر کے داستان پرورد ماحول میں ہی حاصل کی تھی۔ لیکن اُن کے ساتھ حاجتی کا حقیقی تعارف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے کے سجان الڈسکشن میں ہوا۔ اس کے بارے میں اُن کا کہنا ہے۔

”راقم الحروف نے طالب علمی کے دوران مطبوعہ کتاب الطوا سین علی

گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ (سجان الڈسکشن) میں پائی اور پوری کتاب

دسمبر ۱۹۴۰ء میں نقل کر لی“

علامہ اقبال برصغیر کے بہت عظیم شاعر ہیں۔ محی الدین حاجتی کی عمر اُس وقت تقریباً بیس سال ہوتی جب علامہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ یعنی اقبال کا زمانہ حاجتی نے خود دیکھا تھا۔ پھر شاعر مشرق اور شاعر اسلام ہونے کی وجہ سے حاجتی کو ان سے عقیدت بھی تھی اور محبت بھی۔

منصور الحلاج کے عارفانہ اور صوفیانہ اقوال نے محی الدین حاجی کو علی گڑھ میں متاثر کیا جبکہ اقبال کے فکر و فلسفہ سے وہ پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے۔ مشرق کی ان دونوں ہستیوں کی آگہی کا محور و مرکز عشق رسول ﷺ تھا۔ اور دونوں دنیا میں اسلام کو سر بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ پروفیسر حاجی بھی ایک سچے عاشق رسولؐ تھے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دلدادہ۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ اسلام کا بول ہمیشہ بالا رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال اور حلاج کے فکر و فلسفے کا ایک تقابلی مطالعہ کیا۔ یہ تقابلی مطالعہ ۱۹۷۸ء میں ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے اقبال صدی تقریبات کے سلسلے میں شائع کئے گئے خصوصی رسالے ”محفل اقبال“ میں شائع کیا گیا۔ ”محفل اقبال“ کے پیش لفظ میں اس کے ترتیب کار پروفیسر رشید نازکی لکھتے ہیں۔

”چنانچہ اقبال صدی تقریبات کے ہی دوران اقبال کی تقریباً تمام اہم تخلیقات اور کشمیر سے متعلق اُن کے پورے کلام کا ترجمہ کشمیری زبان میں ہوا۔ اس کے علاوہ سرینگر اور جموں میں شاعر کفن، فکر اور پیام کا فیض عام کرنے کی خاطر دو عظیم الشان سمینار بلائے گئے۔ جن میں تقریباً ملک کے تمام گوشوں سے آئے ہوئے اقبال شناس دیدہ وروں نے شرکت کی، زیر نظر مجموعے کے اکثر مضامین جموں کے اقبال سمینار میں پڑھے گئے ہیں۔“

أبا لعلیٰ حسین ابن علی المنصور الحلاج تیسری صدی ہجری کے ایک بلند پایہ صوفی بزرگ ہیں۔ مسلم اکثریتی علاقوں کے علاوہ اقلیتی علاقوں میں بھی اُن کے معتقدات نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ جس کے آثار آج تک کشمیری اور ایرانی ادب میں پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اُن کی زندگی کو چیتاں بنا ڈالا۔

اُن کے اقوال کے مجموعے ”کتاب الطوا سین“ کی پروفیسر محی الدین حاجتی نے تشریح کی ہے۔ جو اُن کا بہت بڑا کارنامہ مانا جاتا ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کشمیری النسل ہے۔ اُن کے جد کشمیر سے ہی ہجرت کر کے لاہور چلے گئے۔ کشمیر کے جنت نما مناظر سے اقبال کا تعلق جسم اور جان کا رہا ہے۔ لیکن اقبال کے فکر و فن کو عام کرنے کے معاملے میں ۱۹۷۶ء تک کشمیریوں کا حصہ بالکل نہ ہونے کے برابر تھا۔ اقبال صد سالہ تقریبات کے دوران دُنیا کے دیگر ممالک کے علاوہ ہندوستان اور کشمیر میں بھی اُس عظیم شخصیت کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے فکر اور فلسفے کو عام کرنے کے لئے سینکڑوں پروگرام منعقد کئے گئے۔ اقبال صدی کے دوران کشمیریوں نے سمیناروں، مباحثوں اور مشاعروں کے ذریعہ، اقبال کیلئے وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کیں، جو وہ اقبال کیلئے کر سکتے تھے۔ اسی دوران جموں اور سرینگر میں شاعر کے فن اور فکر اور پیام کا فیض عام کرنے کی خاطر دو عظیم الشان سمینار بلائے گئے۔ ان سمیناروں میں پڑھے گئے مقالوں کو ۱۹۷۸ء میں جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز نے کتابی صورت میں ”محفل اقبال“ کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں دوسرا ہی مضمون پروفیسر محی الدین حاجتی کا ”علامہ اقبال اور حلاج“ کے عنوان سے ہے۔

حلاج اور اقبالؒ کے درمیان تقریباً دس صدیاں حائل ہیں۔ حلاج کی پوری زندگی کے حالات زیادہ تر قیاس آرائیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اقبال کا فی خوش قسمت ہیں۔ حالانکہ تاریخ

پیدائش میں کوئی تضاد ہو بھی، لیکن اُن کی زندگی پر اتنی تحقیقیں ہو چکی ہیں کہ اُن کی زندگی کا ہر گوشہ ہمارے سامنے عیاں ہیں۔ جبکہ المنصور الحلاج کی زندگی ترقی کی اتنی منزلیں طے ہونے کے بعد بھی پردہ راز میں ہے۔ حلاج کے بارے میں حاجتی صاحب رقمطراز ہیں۔

”ہمارے اکابر علماء نے حلاج کی شخصیت کو تین مختلف روپوں میں پیش

کر دیا۔ ابو یوسف فروینی (وفات ۱۴۰۶ء) مصنف ”اخبار الحلاج“

سے لے کر ابن خلدون (وفات ۱۴۰۶ء) تک ابتدائی تین صدیوں کے

اندر اندر ہی حلاج کی شخصیت ایک چیتاں میں بدلتی گئی۔ اگر ایک

طرف حضرت عطار (وفات ۱۲۲۳ء) مصنف ”حلاج نامہ“ اور مولانا

رومی (وفات ۱۲۷۳ء) نے حلاج کو علم و عرفان کا ستون تصور کر لیا۔ تو

دوسری طرف علامہ ابن تیمیہ (وفات ۱۳۲۸ء) نے ”فتاویٰ فی ردِّ

الحلاج“ کے ذریعہ حلاج کی صوفیانہ حیثیت کو ہی کلی طور زائل کرنے کی

کوشش کی۔ ان دو انتہا پسند گروہوں کے درمیان نصیر الدین طوسی

(وفات ۱۲۷۳ء) اور محمود شبستری (وفات ۱۳۹۴ء) نے اگرچہ حلاج

کی بے لاگ تنقید بھی کی۔ لیکن پھر بھی اکثر معترضین حلاج کے عرفان کو

سمجھنے سے قاصر رہے۔ ان متضاد روایات کے مشاہدے پر ہی علامہ

اقبال کو کہنا پڑا کہ۔

رقابت علم و عرفان میں غلط بنی ہے منبر کی

کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا“

ہر عظیم شخصیت کو اپنی عظمت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اگر شخصیت بادۂ عرفان سے سرمست و سرشار ہو تو اُس کو بہت دور کی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے متعلق پہلے ہی کہہ جاتے ہیں کہ کیا ہوگا؟ علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی تصدیق تو حلاج نے اپنے ہی زمانے میں کی تھی۔ کہتے ہیں۔ ترجمہ

”یعنی جو عالم ناسوت (دارۂ اولیٰ) میں رہتے ہوئے بھی مجھے دیکھ ہی

نہ سکا۔ اس نے میرا نام زندیق رکھا اور جو عالم کشف (دارۂ دوم) سے

واقف ہوا۔ اس نے مجھے عالم ربانی گمان کیا“

اگر اس مضمون میں صرف میں منصور حلاج کی زندگی کا تذکرہ کرنے بیٹھ جاؤں، تو نہ ہی مقالہ مکمل ہوگا اور نہ ہی منصور کی زندگی حقیقت اور مبالغے کے پردوں سے باہر آئی گی۔ اگر منصور اور اقبال کی تصنیفات کا تقابل غرض ہو۔ تو پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جہاں اقبال کی تقریباً ساری تصنیفات اُن کی زندگی میں ہی کئی کئی بار شائع ہوئی اور اقبال پر اُن کی زندگی میں ہی کئی کتابیں لکھیں گئیں اور آج تک یہ سلسلہ بہت بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ وہی منصور کی ۳۲ تصنیفات میں سے ۳۱ اُن کی زندگی میں ہی تلف کر لی گئی۔ اور زمانے کی دست و برد سے صرف ایک کتاب ”کتاب الطوا سین“ بچ نکلی۔ جس کے متعلق بحث اس کتاب میں ہو چکی ہے۔

جہاں تک منصور اور اقبال کے نظریات کا تعلق ہے۔ ان میں بہت حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ جسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال اور منصور الحلاج کے فکری ماحول میں قریب قریب مطابقت تھی۔ دونوں کے زمانوں میں مختلف علوم کا ٹکراؤ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں جو مختلف رجحانات اور تحریکات چلیں۔ انہوں نے مذاہب کے ماننے والوں کو دم بخود کر دیا۔ اور اس کے درمیل میں مذہب بیزاری کا ایک زبردست رجحان شروع ہوا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اس مذہب بیزاری کا وہی علاج پیش کر دیا جو حلاج نے اپنے زمانے میں پیش کیا تھا۔

پروفیسر حاجتی کا مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے حلاج اور اقبالؒ کی زندگیوں کے بارے میں تاریخی شواہد کی بنیاد پر بات کی ہے۔ اس حصے میں وہ اقبالؒ کو خوش قسمت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن کی زندگی کی ایک ایک بات عوام تک صاف صاف اور عیاں پہنچی ہے۔ جبکہ حلاج کی برگشتہ طالعی یہ رہی کہ جس کے من میں جو آیا، اُن کے متعلق لکھ ڈالا اور ایک حقیقی تاریخی کردار کو اساطیری بنا ڈالا۔ اس حصے میں اُن اثرات کی تھوڑی بہت نشاندہی بھی کی گئی ہے جو اقبالؒ نے حلاج سے قبول کئے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں۔

”حلاج کے تنبوع میں علامہ اقبالؒ نے جاوید نامے میں صرف چار

طواسینِ نبوت (طاسینِ گوتم، طاسینِ زرتشت، طاسینِ مسیح، طاسینِ محمد ﷺ)

باندھے ہیں اور اپنی جولان گاہ چار انبیاء کرامؑ کی تعلیمات تک ہی محدود رکھی

ہے۔ لیکن اس تتبع کے علاوہ علامہ مرحوم نے باقی تخلیقات میں متعدد بار حلاج

کے عقائد اور نظریات کا حوالہ شاعرانہ یا متصوفیانہ طریقے پر دیا ہے۔“

مقالے کے دوسرے حصے میں اُن خیالات کے ساتھ بحث کی گئی ہے جو حلاج اور اقبالؒ

میں مماثل ہیں۔ پروفیسر حاجتی نے اس بحث میں ”خودی“ اور ”انانیت“ کو اس کے دوسرے

کے مترادف قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ ایک سکے کے دو پہلو ہیں۔ فرماتے ہیں

”حلاج نے ”انانیت“ کا سہارا لیا اور علامہ نے ”خودی“ کا۔ جو تجرباتی

نکتہ نگاہ سے دراصل ایک چیز کے دو نام ہیں۔ غفلت زدہ دانشوروں کے لئے یہ

دونوں چیزیں یا ماوراءِ ادراک تھیں یا محض توہم۔“

پروفیسر حاجتی مرحوم نے اپنے اس مقالے میں اقبال اور حلاج کے مماثل خیالات پر بڑی خوبصورت بحث کی ہے۔ ابلیس، انسان کا مقام، عرفان، عقل و عشق، تسخیر کائنات، روح اور راہ نجات کے متعلق دونوں کے خیال میں کہاں کہاں مشابہت ہے اور کہاں کہاں علامہ مرحوم نے حلاج کی اتباع کی ہے۔ اس پر حاجتی صاحب نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر حاجتی نے اس مقالے میں جس طرح سے دونوں روحانی شخصیات کے افکار و نظریات کا غائر جائزہ پیش کیا ہے، اُس سے اسلامی اور روحانی علوم کے ساتھ اُن کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال شناس ہونے کے ساتھ ہی اُن کے منصور شناس ہونے کا بھی یہ مقالہ ایک ثبوت ہے۔ ”معرفت“ کے بارے میں ان دونوں کے افکار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”حلاج اپنے ماحول اور اپنے نظریات کے عواقب سے سراسر بے نیاز رہ کر اپنے روحانی تجربات پیش کرتے رہے۔

”معرفت ایک چیز ہے۔ جو جہات، علّات اور مادی آلات سے بہت پہلی تھی۔ پھر جہات اس کو کیسے سمو سکیں گے اور منطقی نہایات اس کے ساتھ کیسے ملحق ہو سکیں گیں“ (طاسین المعرفۃ)

یعنی جو منظور تک واصل ہوا۔ وہ نظر سے بے نیاز ہو گیا (منصور)

لیکن علامہ اقبال نے ماحول کی پوری عکاسی کے ساتھ ساتھ خاص موضوع پر ہی اپنے روحانی تجربات پیش کر دئے اور اپنی طرف سے حتی الامکان اسلوب کلام میں احتیاط سے کام لیا۔

ازاں ترسم کہ پنہا نم شود فاش

غم خود را گویم بادل خویش

اس طرح اس پورے مقالے میں پروفیسر حاجتی نے منصور حلاج اور علامہ اقبال کے

افکار کا موازنہ کر کے ایک بہت بڑا علمی کارنامہ انجام دیا۔ مقالے کے آخر میں اتباع رسول کو نجات کا واحد ذریعہ قرار دے کر اس کے متعلق دونوں کے نظریات میں یکسانیت تلاش کرتے ہوئے پروفیسر حاجتی لکھتے ہیں۔

”چنانچہ علامہ مرحوم کے مجموعی انداز فکر کو جب ہم کتاب الطواصین کے مضمونات سے غائر موازنہ کریں گے۔ تو صاف نظر آئے گا کہ دونوں کے نزدیک عرفان ذات کا واحد وسیلہ یہی اتباع رسول ہے۔
 کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
 یہ جہاں چیز ہے کیا لوح قلم تیرے ہیں“

جہاں تک اس مقالے کے اسلوب اور دیگر خصوصیات کا تعلق ہیں۔ مقالے کی زبان عمدہ علمی زبان ہے۔ مقالے میں تسلسل کے ساتھ افکار اقبال و منصور پر بحث کی گئی ہے۔ اس حوالے کے ذریعے ہم آسانی سے دونوں بزرگوں (حلاج اور اقبال) کے شعری افکار و تجربات کو سمجھ پاتے ہیں۔ میری نظر میں یہ مقالہ پروفیسر حاجتی کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پروفیسر محی الدین حاجتی عربی کے استاد تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم پر بھی اُن کی گرفت مضبوط تھی۔ سائنس، جغرافیہ، ہسٹری، ریاضی، علمِ بشریات اور ارضی اور فلکی علوم بھی حاجتی صاحب جانتے تھے۔

پروفیسر حاجتی ایک شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، نقاد ایسے کہ جی نے چاہا تو کسی کو آسمان پر بٹھا دیا اور نہ تو زمین میں گاڑ دیا۔ اس کی وجہ اُن کا مزاج تھا۔ اُن کے منفرد مزاج نے ہمیشہ اُن کی تنقید کو متاثر کیا۔ حاجتی صاحب ایک مکمل مترجم اور مفسر بھی تھے۔ اس سلسلے میں ”کتاب الطوا سین“ نثر کے میدان میں اور ”مسدس حالی“ شاعری کے میدان میں اُن کی دین ہے۔ حاجتی صاحب دوسرے شعراء کی غزلوں، اشعار اور رباعیات کی تشریح بھی بڑے دلکش انداز میں کرتے رہے۔ وہ اب حاجتی کی غزلوں اور وژن کے انہوں نے ایسے ترجمے کئے کہ عام قارئین ہی نہیں بلکہ علماء و فضلاء بھی پڑھنے کے بعد دھنگ رہ گئے۔ کسی کے اشعار کی شرح لکھنا کوئی اُن سے سیکھے۔ اس میدان میں اُن کا شاہکار مرزا عارف کی ایک کشمیری رباعی کی اردو شرح ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجتی صاحب نے مرزا عارف کی رباعی کی شرح اس طرح کی ہے کہ کشمیر کے سائنس داں مرزا عارف نے جب دیکھا ہوگا تو یقیناً حیران ہوئے ہونگے۔ پروفیسر حاجتی کا یہ مضمون ”گلریز“ کے جولائی ۱۹۵۴ء کے شمارے میں ”آگ اور

”وژن“ کشمیری کی ایک اہم شعری صنف ہے۔

۱

مرزا عارف کی ایک رباعی کے عنوان سے شائع ہوا۔ پروفیسر حاجتی اس مضمون کی ابتداء ہی بڑے عالمانہ انداز میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

”ماہرین طبقات الارض نے مشہور فرانسیسی ہیئت دان لاپلاس کی پیش کردہ مفروضہ سحابیہ Nebular Hypothesis سے شاید اشارہ پا کر کڑھ ارضی کی ابتداء سے متعلق یہ انکشاف کیا ہے کہ آج سے کم از کم دو ارب سال پہلے ہماری زمین نہ صرف ایک سحابیہ Nebula تھی۔ بلکہ آتش فشانی میں یہ گیس سورج سے کسی صورت میں سرد تر نہیں تھا۔ مرور زمانہ کے ساتھ گیس مائع کی صورت اختیار کر چکا، اور مائع ٹھوس شکل میں منتقل ہوا۔ اور بالآخر ہزار ہا ارتقائی منازل طے کر کے جرثومہ اول اشرف المخلوقات بنا“

جہاں تک آگ کا تعلق ہے کچھ قوموں نے آگ کی عبادت کی اور کچھ اقوام نے اس سے نفرت کی۔ آگ کی تاریک کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات مختلف رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے مفکروں اور دانشوروں نے آگ کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن سبھی پر پروفیسر محی الدین حاجتی نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ آگ کو بنیاد بنا کر نور و ظلمت کے اسرار کی نقاب کشائی بھی اس مضمون میں پروفیسر حاجتی صاحب نے کی ہے۔

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ میں آگ کی سائنسی، مذہبی اور سماجی تاویلات پیش کر کے پروفیسر حاجتی نے اپنی علمی استعداد اور گہرائی کا ثبوت دیا ہے۔ دوسرے حصے میں اصل رباعی کی شرح کی گئی ہے۔ اس شرح میں پروفیسر حاجتی کے ایک مکمل شارح ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

مضمون میں عالمانہ تمہید کے بعد حاجتی صاحب نے رباعی کے اشعار کی تشریح کی ہے۔

تشریح کے بعد سائنس، جغرافیہ اور مذہب کو بنیاد بنا کر اس رباعی کی پرفند و تبصرہ کیا گیا ہے۔ رباعی کی شرح کے دوران سائنسی اور استدلالی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ایک سائنس داں کی طرح پروفیسر حاجتی آگ کی ماہیت اور حقیقت سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں

”جب ہم کہتے ہیں کہ زید کا ہاتھ آگ سے جل گیا۔ تو اس سے یہ مراد ہے کہ آگ کے نیز رفتار سالمات نے ہاتھ کے کم رفتار سالمات کو اپنی رفتار پر کھینچنے کی کوشش کی اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ کے مادی اجزاء کی قدرتی ترکیب بگڑ گئی۔ عنصری اجزاء کی اس پریشانی سے اعصاب انسان مشتعل ہوئے اور یہی اشتعال یا ہیجان اجزاء دماغ میں جلن کا خیال (Sensation) پیدا کرتا ہے۔“

اس طرح حاجتی صاحب نے مرزا غلام حسن بیگ عارف مرحوم کی رباعی کی ایسی تشریح کی کہ لوگ کیا مرزا بھی دیکھتے رہے ہونگے۔ اس تنقیدی مضمون میں پھر حاجتی کے مزاج کا دخل نظر آتا ہے۔ انہوں نے چاہا تو عارف کی رباعی کو بہت دور کے جاے پہنادیے۔ دوسری بات یہ کہ آج قاری کو احساس ہوتا ہے کہ حاجتی صاحب نے رباعی کی آڑ میں اصل میں اپنی علمی بصیرت کا لوہا منوانا چاہا ہے۔ اور وہ اس میں بالکل کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ اس مضمون کی زبان عام فہم، صاف اور شگفتہ ہیں۔ یہ مضمون ایک Informative Guide سے کچھ کم حیثیت نہیں رکھتا۔ جسمیں تاریخ، مذاہب، اعتقادات، اور سائنس کے علاوہ ادب عالی کے نمونے ایک ساتھ پڑھنے کو ملتے ہیں۔



فصل سوم

تخلیق کار حاجتی

پروفیسر حاجتی

کی انشائیہ نگاری

جب بھی افسانوی ادب کے بارے میں بات کی جاتی ہے، تو سب سے پہلے قصہ ہماری نظروں کے سامنے رقص کنناں ہو جاتا ہے۔ فرصت کے ایام میں قصے کہے اور سُنے جاتے تھے۔ بے فکروں کو جب وقت گزاری کے شغل نہ سوجھتے تھے، تو وہ قصوں کی دنیا آباد کر کے ان ہی میں پناہ لیتے تھے۔ بادشاہت اور خاندانی راج کے عروج کے زمانے میں بادشاہوں نے داستان کے دامن کو پکڑ لیا۔ سلطنت چاہیے ہاتھ سے جائے لیکن داستان ساتھ رہے۔ کبھی لوگ، امیر غریب، بادشاہ رعایا اس زمانے میں داستان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے۔ لیکن زمانہ جاگنے لگا تو لوگوں نے داستانوی دنیا کو خبر باد کہہ کر حقیقت کی دنیا آباد کر لی۔ اس حقیقت نگاری میں بھی قصہ زندہ رہا۔ لیکن ناول کے روپ میں۔ اختصار، تسلسل اور حقیقت ناول کے بنیادی اوصاف ٹھہرے۔ صنعتی انقلاب نے جہاں انسان کی زندگی کو آسان بنا دیا اور آرام آسائش کی سبھی چیزیں میسر رکھ دیں۔ وہی اس کی فرصت کو بھی مشینوں نے ہضم کر لیا۔ اب ناول کیلئے وقت کہاں تھا تو قصہ کو اور مختصر کر کے افسانے کے روپ میں پیش کیا گیا۔ افسانہ کے لئے یہ لازمی شرط ٹھہری کہ یہ حقیقی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہو۔ علاوہ ازیں قصہ کی ترتیب اور تکمیل افسانے کے صوری لوازم ہیں۔ کج روزمانے نے کج رو چیزوں کی فرمائش کی۔ صنعتی انقلاب نے دنیا میں پیچ و خم پیدا کئے۔ اب جب انسانی زندگی میں ہی ترتیب اور تنظیم نہ رہی تو انسان کی پیدا کردہ چیزوں میں اس کو تلاش کرنے کا کیا فائدہ۔

ان ہی حالات میں ادب کی ایک کج رو اور پیچ و خم والی صنف پروان چڑھی۔ اس صنف کو انشائیہ کہتے ہیں۔ انشائیہ نثری اظہار کی ایک ایسی صنف ہے جس میں حقیقت کا اظہار شخصی رد عمل کے طور پر ہوتا ہے۔ عدم تکمیل، رمزیت و اشاریت، غیر منطقی ربط اور اختصار اس صنف

کے امتیازات ہے۔ یہ صنف قاری کو عجیب و غریب انداز میں دعوت فکری دیتی ہے۔ اس صنف کا ایک اہم وصف مسرت بہم پہنچانا ہے۔ انشائیہ میں زبان و بیان میں بانگن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

انشائیہ فرانسیسی زبان کی پیداوار ہے۔ آدم دی مون تین نے اس صنف کی ابتداء کی۔ فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے یہ اردو میں وارد ہوئی۔ اردو میں اس کے ابتدائی نقوش سرسید احمد خان کے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن اپنے تمام فنی محاسن کے ساتھ انشائیہ ایک منفرد صنف کی حیثیت سے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں سامنے آیا۔ اس زمانے میں کشمیر کے بہت سارے قلمکار اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کے اظہار کیلئے مختصر نثری اضافہ کو ذریعہ اظہار بنا رہے تھے۔ افسانے کی صنف مقبول نثری صنف تھی۔ انشائیہ کو شاید ہی کوئی قلمکار ذریعہ اظہار کے طور پر برتنا تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے ختم ہوتے ہی جب ملک کے دوسرے حصوں میں انشائیہ نگاری کا رواج از سر نو شروع ہو رہا تھا۔ تو کشمیر کے چند قلمکاروں نے بھی اس میدان میں اپنے ہاتھ دکھانے شروع کر دیئے۔ ان ہی قلمکاروں میں پروفیسر محی الدین حاجتی بھی ایک نام ہیں۔ جنہوں نے کچھ انشائیے لکھ کر اس میدان میں اپنا نام امر کر دیا۔ اُن کی قلمی کاوشوں کا اعتراف ”کشمیر میں اردو“ کے مصنف پروفیسر سردی اس طرح کرتے ہیں۔

”تصنیف و تالیف کے میدان میں اس وقت جو علماء اور اہل قلم ہیں۔ ان میں پروفیسر محی الدین حاجتی بڑی متنوع دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ وہ عربی کے پروفیسر ہیں، کشمیری تحریک کے علمبردار اور اردو اور کشمیری دونوں میں یکساں سہولیت کے ساتھ قلم سنبھال سکتے ہیں۔“

پروفیسر سردی آگے رقمطراز ہیں۔

”پروفیسر حاجتی اُردو میں بے شمار مقالات اور مضامین کے مصنف ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ اچھے انشائیہ نگار اور کسی حد تک مزاح نگار بھی ہیں۔“

ایک عربی مقولے کے مطابق انسان ہنسنے والا جاندار ہے۔ ہنسنا اور ہسانا انسان کی فطرت ہے۔ ہنسی کے ذریعے خوشی پھیلتی ہے۔ اس لئے اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور ہنسانے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے۔ ادب میں بھی ہنسنے ہنسانے کے طریقے وقت کے ساتھ ساتھ آتے رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے اصول بھی وضع کئے گئے۔ ادب میں ہنسنے ہنسانے کے طریقوں کو ظرافت کہتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب ظرافت کیلئے بھی پیمانے مقرر ہو گئے۔ اعلیٰ درجے کی ظرافت اُسے ٹھہرایا گیا جو نہ ٹھہ ٹھہ ہنسائے اور نہ ہی قاری کو کھل کر مسکرانے پر مجبور کرے بلکہ اس کے ذہن کو گدگدائے اور ایک فرحت عطا کرے۔ یہی اعلیٰ درجے کی ظرافت ہمیں محی الدین حاجتی کے انشائیوں میں ملتی ہے۔ اُن کے انشائیہ مزاحیہ ہیں۔ جن کو پڑھ کر صرف دل کو فرحت ہوتی ہیں اور ہونٹ خاموش رہتے ہیں۔ اُن کے مزاحیہ انشائیوں میں سے ایک ”بیوقوفی“ ہے۔ اس انشائیہ میں حاجتی صاحب ”وقوف کے“ لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے منطقی دلیلوں اور یقین آفرینی کے ساتھ عقل و دانائی کی باتیں نیم مزاحیہ انداز میں بڑی خوبی سے کہہ جاتے ہیں۔ لفظ ”وقوف“ کی وضاحت پروفیسر حاجتی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

”چنانچہ ”وقوف“ کو سکون کا مترادف مان کر، لغوی معنوں کی رو سے ہم متحرک چیز کو ”بے وقوف“ کہہ سکتے ہیں۔ اس دلیل کے پیش نظر، مادی موجودات میں سے سوائے جمادات کے کوئی چیز ”با وقوف“ نہیں۔ بلکہ حالیہ جوہری تحقیقات کی بناء پر، جمادات بھی داخلی حرکت سے بے نیاز ہونے کے سبب ”بے وقوف“ ہی کہلائیں جائیں گے۔“

حاجتی صاحب نے اس مضمون میں انشائیہ نگاری کے تمام لوازمات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ”بیوقوفی“ کو موضوع بنا کر دنیا جہاں کی باتیں کی ہیں۔ اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پروفیسر حاجتی نے اس انشائیہ میں بھی سائنس اور نباتات و جمادات کو منطقی یقین اور دلیلوں کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے۔

پروفیسر حاجتی صاحب نے کئی انشائیے لکھے۔ اُن کا ایک اور دلچسپ اور مزاحیہ انشائیہ ”غلط فہمی“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس ایسے میں بھی حاجتی صاحب کا انداز وہی سنجیدہ مزاح کا ہے۔ مثلاً غلط فہمی لفظ پر بحث کرتے ہوئے حاجتی صاحب کہتے ہیں۔

”سطحی ملاحظہ پر یہ ظاہر ہے کہ ”غلط فہمی“ دو لفظوں سے مرکب ہے ”غلط“ اور ”فہمی“۔ لیکن آپ غلط کس واقعہ کو قرار دیں گے اور فہم کا کونسا مطلق اندازہ استعمال کر کے کہہ سکیں گے کہ سوچنے اور سمجھنے کا یہ معیار صحیح ہے اور باقی ذرا ایسے نادرست اور بفرض محال آپ صحت معیار پر قادر ہونگے بھی، تو بھی یہ انفرادی فیصلہ ہوگا، اجتماعی نہیں۔ کیونکہ آپ کے وسائل شعور میں آپ کی شخصیت سب سے زیادہ کار فرما ہے۔ جس کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ وہ باقی شخصیتوں سے ممتاز اور منفرد ہو۔“

پروفیسر حاجتی کے ان انشائیوں کی زبان صاف اور عام فہم ہے۔ ان انشائیوں میں حاجتی کی ظریفانہ سوچ اور انداز کا علم ہوتا ہے۔ اگرچہ اُن کے صرف دو ہی انشائیہ دستیاب ہوئے ہیں۔ پر ان ہی دو انشائیوں میں انہوں نے اعلیٰ درجہ کی ظرافت کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کے تمام لوازمات کا لحاظ رکھا ہے۔ پروفیسر حاجتی کی ذہنی ترنگ اور انفرادی ہمہ رنگی نے ان انشائیوں کی شان دو بالا کر دی ہے۔ مختصر اُ یہ کہ پروفیسر حاجتی ہر فن مولا تھے۔ وہ جس

بھی میدان میں قدم رکھتے، اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے۔ اُن کے بارے میں محمد احسن احسن کا یہ کہنا ”کہ حاجتی میدانِ ادب کے ایسے کھلاڑی ہیں جو ہر کھیل کو بخوبی کھیلنے کے علاوہ اپنے مزاج کے مطابق کھیلتے ہیں“ بہت ہی صحیح اور بر محل معلوم ہوتا ہے۔



پروفیسر حاجتی

اور اردو صحافت

صحافت بنیادی طور پر نثر کا ہی ایک طاقتور شعبہ ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو نثر کی باضابطہ ابتداء انیسویں صدی کے آخر میں اُس وقت ہوئی، جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۷۹ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ حالانکہ اس زبان کا بول بالا ریاست کے اطراف و اکناف میں اس سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کشمیر میں اردو زبان میں تحریر کی روایت انیسویں صدی کے نصف آخر میں پروان چڑھی۔ 1882ء میں ریاست کا پہلا اردو گزٹ بدیا بلاس شائع ہوا۔ لیکن اسے پہلے ہی کشمیر میں اردو عام و خاص کی زبان بن چکی تھی۔ ہر گوپال خستہ نے 1872ء میں اردو میں کشمیر کی پہلی تاریخ ”گلدستہ کشمیر“ کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں خستہ اردو کی مقبولیت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

”گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ اردو بولتے ہیں اور ہانجیوں وغیرہ

طائفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں“

سرکاری سرپرستی کے بعد یہ زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی زندگی میں موثر رول ادا کرنے لگی۔ چنانچہ تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں اور عدلیہ میں اسکے برتے جانے سے نہ صرف زبان میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ اسکی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو شعر و ادب کی ترویج اور توسیع میں اخبارات اور رسائل کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ غیر سرکاری طور پر ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا

باقاعدہ اور باضابطہ آغاز ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو ملک راج صراف کے اخبار ”رنبیر“ کے شائع ہونے سے ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں پریم ناتھ بزاز کے ”وتنتا“ کی اشاعت سے ریاست میں اردو صحافت کے لئے نئے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد اخبارات اور رسائل کے شائع ہونے کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ آج تک شہود سے جاری ہے اور انشاء اللہ آگے بھی جاری رہے گا۔

رسائل کی اشاعت بھی ریاست میں ”رنبیر“ کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوئی اور آج تک شہود سے جاری ہے۔ ریاست سے ہر سال اردو میں کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور شائع ہوتا ہے۔ جو معروف رسائل جموں و کشمیر سے اُس زمانے یا پھر اُس کے بعد شائع ہوئے۔ اُن میں جموں کے ”پریم“ اور ”فردوس“ کے علاوہ کشمیر کے ”تعمیر“، ”جدید تعلیم“، ”سوریا“، ”دیہاتی دنیا“، ”کونگ پوش“، آزاد اور کشمیر بزم ادب کا ترجمان ”گلریز“ قابل ذکر ہیں۔

گلریز کی اشاعت ۱۹۵۰ء کے بعد سرینگر سے شروع ہوئی۔ اس رسالے نے بہت جلدی ریاست کے ادبی اور عوامی حلقوں میں اپنی پہچان بنائی۔ یہ رسالہ اصل میں ایک ادبی رسالہ تھا اور اس کے اکثر مضامین ادبی اہمیت کے ہوتے تھے، اس رسالے کے بارے میں ڈاکٹر برج پریتی کا کہنا ہے۔

”گلریز بڑا معیاری پرچہ تھا۔ سرینگر سے شائع ہونے والا یہ پرچہ کشمیری اور اردو زبانوں کیلئے وقف تھا۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود ”گلریز“ نے یہاں کے ادبی رسائل میں منفرد جگہ بنائی تھی۔“^۱

اخبارات اور رسائل کی اشاعت سے وادی کے قلم کاروں کو لکھنے کا محرک ملا اور کئی نئے قلم کار ان اخبارات اور رسائل کی بدولت سامنے آئے۔ اس طرح اخبارات کے اس سلسلے نے جموں و کشمیر کو بہت سارے قد آور اور بڑے صحافی دیئے۔ جنہوں نے جموں و کشمیر میں

^۱ ”جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کی نشوونما“ از ڈاکٹر برج پریتی

اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہنگامہ خیز کارنامے انجام دیئے۔ اُن ہی ہنگامہ خیز صحافیوں میں ایک نام پروفیسر محی الدین حاجتی کا ہے۔ جنہوں نے بیسویں صدی کے پانچویں عشرے کے بعد باقاعدہ طور پر غیر سرکاری صحافت میں قدم رکھا اور کتاب صحافت میں اپنا نام ان مٹ سیاہی سے درج کرایا۔ پروفیسر حاجتی نے بھی صحافتی سفر اصل میں ”گلریز“ سے ہی شروع کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ سری پرتاب کالج سرینگر کے سالانہ رسالے ”پرتاب“ کے مجلس ادارت کے ممبر ہونے کے ساتھ ہی اس کے کشمیری سیکشن کے مدیر رہے۔ علاوہ ازیں اس رسالے میں اُن کے مضامین تواتر کے ساتھ چھپتے رہتے تھے۔ لیکن حقیقت میں اُن کی صحافتی وسعت اور قابلیت کا نکھار ”گلریز“ میں ہی ہوا۔ ”گلریز“ یہاں کی ادبی صحافت کے لئے ایک بہت بڑے پلیٹ فارم کی صورت میں سامنے آیا اور اس نے اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان و ادب کی بے انتہا خدمت انجام دی۔ گلریز کی انہی خدمات کے پیش نظر جب بھی ریاست میں اُردو سائل کی بات کی جائے گی ”گلریز“ کا نام ہمیشہ عزت و توقیر سے لیا جائے گا۔ صحافتی دنیا میں گلریز کو جو مقام ریاست میں بہت کم عرصہ میں نصیب ہوا اُس میں پروفیسر حاجتی کا بہت بڑا رول ہے اور حقیقت یہ ہے کہ گلریز اور محی الدین حاجتی لازمِ ملزوم ہیں۔

جہاں تک پروفیسر محی الدین حاجتی کی صحافتی زندگی کا تعلق انہوں نے صحافت کے شعبہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ اس تعلق سے کشمیر کی صحافت میں اُن کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ حاجتی صاحب کے بارے میں پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ وہ کشمیری، اُردو، انگریزی اور عربی زبانوں میں یکساں سہولیت کے ساتھ قلم اٹھا سکتے تھے۔ اُن کی صحافتی خدمات کے سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ اکیس سال تک سری پرتاب کالج کے رسالے ”پرتاب“ کے کشمیری سیکشن کے مدیر رہے۔ اس لمبے عرصے میں کئی قلم کاروں نے

اس رسالے کے توسط سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اُن میں سے کچھ قلم کاروں نے صفحہ اول کے قلم کاروں کی صف میں جگہ بنائی۔ پروفیسر حاجتی کی ادارت میں رسالے کے کشمیری سیکشن نے بالخصوص اور پورے رسالے نے بالعموم معیار کی تمام ممکنہ بلندیوں کو چھو لیا۔ چونکہ اس باب میں صرف پروفیسر حاجتی کی اردو صحافت پر بات کی جائے گی، اس لئے ہم اُن اقدامات کے بارے میں بات نہیں کر سکتے، جن کی وجہ یہ رسالہ ”پرتاب“ آج بھی حاجتی صاحب کی یاد دلاتا ہے۔

کتاب کے اس باب میں ہمارا سروکار پروفیسر حاجتی کی اردو صحافت کے ساتھ رہے گا۔ حاجتی صاحب کی صحافتی زندگی کی ابتدا تو اُسی وقت ہوئی تھی جب انہوں نے علیگزہ یونیورسٹی سے صحافت میں ڈپلوما کیا تھا۔ لکھنے کی ابتداء بھی انہوں نے وہاں سے ہی کی تھی۔ واپس آنے کے بعد اُن کے اردو مضامین یہاں کے معروف رسائل ”پرتاب“، ”گلریز“، ”شیرازہ“، ”ہمارا ادب“ اور مختلف اخبارات وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن جہاں تک کسی رسالے کیساتھ باضابطہ وابستہ ہونے کا تعلق ہے۔ اس میں ”گلریز“ کا نام ہی سب سے پہلے لیا جاسکتا ہے۔

”گلریز“ کشمیر بزم ادب کے ترجمان کے طور پر ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس کے بانی مشہور ادیب، شاعر اور کشمیر کے سائنسداں مرزا غلام حسین بیگ عارف تھے۔ یہ رسالہ دو زبانوں اردو اور کشمیری میں چھپتا تھا اسلئے کشمیر میں ہی نہیں بلکہ کشمیر کے باہر بھی لوگ اس کے انتظار میں رہتے تھے۔ محمد صدیق کبروی اس رسالہ کے مدیر و پبلیشر تھے۔ ابتداء سے لیکر مارچ ۱۹۵۳ء تک رسالہ کی نظر و ترتیب کی ذمہ داری محمد امین کاکل کے سپرد تھی۔ اس دوران پروفیسر حاجتی کے متعدد مضامین اس رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ مارچ ۱۹۵۳ء کے بعد سے اگست ۱۹۵۳ء تک نظر و ترتیب کا کام دوا شخص کو سونپا گیا۔ ایک عبدالحق برق اور دوم

محی الدین حاجتی۔ لیکن اگست ۱۹۵۳ء کے بعد رسالے کی نظر و ترتیب کی ذمہ داری مکمل ایک سال تک اکیلے پروفیسر حاجتی نے پوری کی۔ اس دوران یہ رسالہ ترقی کی منزلوں سے آگے بڑھتا ہوا، قومی اہمیت کے حامل رسائل کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ یہ پروفیسر حاجتی کی ان تھک محنت اور لگن کا نتیجہ تھا۔ حاجتی صاحب کی ان خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ”گلریز“ کے بانی مرزا عارف لکھتے ہیں۔

”گلریز کی نظر و ترتیب کا کام ”بزم ادب کشمیر“ نے پروفیسر محی الدین حاجتی کو مارچ ۱۹۵۳ء میں سپرد کیا تھا۔ پروفیسر حاجتی نے اپنی محنت شاقہ سے ”گلریز“ ایسے ادبی ماہنامے کی سابقہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بڑی لگن اور سعی سے اسے آگے بڑھانے میں دریغ نہ کیا۔ اگرچہ ان کے ذوق ”نحو روپراخت“ سے بعض ادیب اور شعراء کو شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن مجموعی طور پر ادارہ پروفیسر صاحب کی کاوشوں کا ممنون و متشکر ہے اور انہیں منظرِ استحسان و ستائش دیکھتا ہے۔“^۱

گلریز رسالے کے ساتھ پروفیسر حاجتی صاحب کی مدیرانہ وابستگی تقریباً دو سال سے زائد عرصے تک رہی۔ حاجتی صاحب سے پہلے ”گلریز“ میں ادارہ یہ لکھنے کی روایت نہیں تھی۔ حاجتی صاحب سے پہلے صرف ایک ادارہ یہ لکھا گیا تھا۔ جو کامل صاحب نے لکھا تھا، اس کے بعد حاجتی صاحب نے اس رسالے کے مختلف شماروں میں، جن میں زیادہ سالنامے شامل ہیں، تقریباً تین ادارے لکھے۔ ان اداروں سے حاجتی صاحب کے صحافتی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔

ہر تحریک اور ہر انجمن یا ادارے کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اپنے کاز کو حاصل کرنے کے

۱۔ گلریز ماہنامہ

لئے وہ مختلف پروگرام اور طریقے کار عملاتے ہیں۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے مقصد کے بارے میں دوسروں کو بھی مطمئن کر کے اُنکی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔ ”گلریز“ کے ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء کے سالنامے میں پروفیسر حاجتی صاحب کا پہلا ادارہ ”برسبیل تذکرہ“ کے عنوان سے چھپا۔ اس ادارہ سے اُس مقصد اور مدعا کی وضاحت ہوتی ہے۔ جو گلریز سے پورا ہونے کی توقع تھی۔ اس ادارے کے پہلے ہی اقتباس میں پروفیسر حاجتی رقمطراز ہیں۔

”چنانچہ عمل اور جدید رد عمل کے ٹکراؤ سے ایک لائحہ عمل نمودار ہوتے ہی اس میں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ پھر وہی عناصر پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی تلافی کیلئے رد عمل کی ابتداء ہوئی تھی۔ اور اس طرح ہر ملک کے ہر دور میں یہ سلسلہ عمل و رد عمل نئی امنگوں اور نئی امیدوں کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے اور اسکی بدولت کارزار حیات میں ایک سرور انگیز کیفیت جاری رہتی ہے۔ جس کے آخری تجزیہ پر آج تک چند اقدار معین ہوئے ہیں۔ جو ہر تحریک کی مشترکہ میراث کی حیثیت سے تحریک کے قواعد و ضوابط، پروگرام اور منہائے مقصد میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ ان اقدار کی جاذبیت فی الحقیقت ان کی حیات پروری، صلاحیت اور افادیت پر منحصر ہے۔ ان میں سے جو بقائے اصلاح کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے اس کو اہل دانش قدر نہیں بلکہ زمانہ سازی کا ایک ہنگامی آلہ قرار دیتے ہیں۔ جو کندہ ہوتے ہی دور پھینکا گیا ہو۔“

پروفیسر حاجتی ارباب اقتدار کے مشن اور کام سے کبھی مطمئن نہیں تھے اور ہمیشہ اُن کے خلاف شعلہ انگیز لہجہ اختیار کرتے تھے۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں کی اقتصادی بد حالی، ذہنی پستی اور سماجی ویرانی کے بہت بڑے غم گسار تھے۔ اُن ک تصنیفات چاہیے اُردو میں ہو یا کشمیری میں

یا پھر انگریزی میں، ہر حال میں کشمیریوں کیلئے فکر مند نظر آتے ہیں ”برسبیل تذکرہ“ میں بھی اسکی مثالیں ملتی ہیں۔

”کشمیر کے ذہنی نشوونما کے تاریخی شواہد کے تفحص میں ارباب اقتدار کو اپنی موت نظر آتی تھی“۔

اس ادارہ کا گہرا مطالعہ کرنے سے حاجتی صاحب کے اندازِ فکر اور اندازِ بیان کا پتہ چلتا ہے۔ جدلیاتی مادیت، سائنسی اندازِ نظر اور انکی تاریخِ فہمی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

حاجتی صاحب کا ایک اور ادارہ ”شذرات“ کے عنوان سے نومبر ۱۹۵۳ء کے گلریز کے شمارے میں شائع ہوا۔ ادارے میں گلریز کے علاوہ ادب کے معیار کے بارے میں خوبصورت باتیں ملتی ہیں۔ اپنی ادبی روایت کو زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ، ماضی کے سرمایوں کی حفاظت کرنے کی تلقین کرنے سے آگے بڑھتے ہوئے حاجتی رقمطراز ہیں۔

”آج کل کے تجزیاتی دور میں ایک طرف تو گل و بلبل ٹائپ کی شاعری کو علی العموم جنسی بھوک سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسری طرف طویل افسانہ نویسی بے کاری کو بڑھانے کا ذریعہ ہے۔“

اس ادارے میں ایک طرف حاجتی صاحب ترقی پسندوں سے متاثر ہوتے ہوئے اُن کے سر میں تال ملاتے نظر آتے ہیں۔

”اب وہ زمانہ نہ رہا کہ جب ادب محض دماغی قییش اور صرف لسانی موشگافی کا کفیل خیال کیا جائے۔ بلکہ اب ادب زندگی کی عکاسی کا بہترین اور زبردست اثر آفریں آلہ مانا جاتا ہے۔“

لیکن حاجتی ادب کو پروپیگنڈا اور نعرہ بازی کے لئے استعمال کرنے کے قائل نظر نہیں آتے ہیں۔

اگر یہ جانتے ہوئے بھی ہم چونک نہ اٹھے تو یارِ ان تیز گام وقتی ”تقاضوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ادب کو پروپیگنڈا کی پستی تک گرا کر ہی دم لیں گے“

اس مضمون میں ادب کے متعلق حاجتی صاحب کے نظریات واضح ہو جاتے ہیں۔ اُردو زبان مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی وارد ہند ہوئی۔ وارد ہونے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ زبان باہر سے آئی۔ بلکہ فارسی بولنے والے ہندی کو نہ سمجھ سکیں اور ہندی والے فارسی کو، اسلئے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ یہی رابطہ کی زبان اُردو ہے۔ ارباب اقتدار نے ہمیشہ اُردو کے ساتھ گھر جمائی کا سا برتاؤ کیا۔ اگرچہ مسلمانوں کے دور میں اس زبان نے سرکاری سرپرستی میں پر پھیلائیے اور اُتر سے اڑ کر دکن بھی پہنچ گئی۔ لیکن مسلمانوں کے بعد اس زبان کے ساتھ جو اناروا سلوک برتا گیا۔ اُسے شاید ہی دوسری زبان زندہ رہتی۔ انگریزوں نے اگرچہ اس کی اہمیت کو بھانپتے ہوئے اس کو مشینی دور میں داخل کر دیا۔ لیکن اپنی تمدنی اور ثقافتی یلغار سے ہر وقت اس زبان کو پچھاڑنے کی کوشش کی۔ آزادی کے بعد ہٹا دیا، ہٹا دیا۔ آری نے آری پار لوگوں کے دلوں کو زہر آلود بنا دیا۔ اُردو اس طوفان سے کیونکر بچتی۔ اُردو کے خلاف کیا کیا نہ کیا گیا۔ لیکن اس زبان نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے۔“

پروفیسر محی الدین حاجتی کا ایک اور شاندار ادارہ ”گلریز“ کے فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس ادارہ کا عنوان ”معروضات“ ہے۔ ادارہ کا پہلا حصہ اُردو کے متعلق ہیں۔ جو مسلسل ناہمواریوں اور نا مساعد حالات کے باوجود زندہ رہی۔ حاجتی صاحب اُردو کے متعلق یہ کہتے ہیں۔

”اُردو کی قسمت میں گویا یہ ایک ازلی فیصلہ ہے کہ جب بھی اس کی مخالفت شدید اور وسائل محدود یا قریب قریب معدوم ہو جائیں۔ اس کی مقبولیت عامہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے“

اُردو زبان کے متعلق انگریزوں کی نیت پر شک کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ”امتیازی زبان“ نام رکھ کر وہ اس کی اہمیت کو کم کرنے کیلئے کوشاں تھے۔ طرہ یہ کہ آزادی کے بعد اپنے جنم داتاؤں کو بھی یہ زبان یاد نہ رہی۔ لیکن عوام کی زبان تھی اور عوام کے پاس ہی ہر دشواری کو سینے سے لگا کر زندہ رہی۔ انگریزوں کی نیت کو کھنگالتے ہوئے، ہندوستان کے ارباب اقتدار سے حاجتی صاحب اس مضمون میں جواب طلب کرتے ہیں۔

”انگریز بہادر براجمائے ہوا تو اسکی ”کم مائیگی کو مستہر کرنے کی نیت سے قریباً ڈیڑھ سو سال تک امتیازی زبان نام رکھ کر سرکاری حمایت سے محروم رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب انگریز اقتدار ختم ہوا اور لیلائے آزادی کے عشق نے عوام کی اکثریت کو مجنوں بنا ڈالا۔ تو سیاست کے ارباب بست و کشاد کو دہلی میں رہ کر بھی دہلی کی زبان یاد نہ رہی اور اب یو۔ پی۔ اور دہلی والوں کو آئینی ذرائع سے ثابت کرنا ہے کہ وہ اُردو بول رہے ہیں لاٹینی یا چینی نہیں۔ کیا ان حوادث کے دباؤ سے اُردو زبان زوال کی طرف مائل رہی یا ترقی کی طرف؟ تاریخ شاہد ہے کہ اُردو نے ان ہی ناخوش آئینہ تین دوروں میں وہ تمام لسانی، ادبی و علمی منازل طے کئے جو دوسرے ممالک کی زبانوں نے کئی صدیوں کے مسلسل، منظم اور حاکمانہ تربیت کے بعد طے کئے ہوں“

بیسویں صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں جب ترقی پسند تحریک کا زور ختم ہو چکا تھا اور جدیدیت کے رجحان کے تحت ”ادب برائے ادب“ کا پروپیگنڈا شروع ہوا۔ تو ادیب

زبان کی طرف زیادہ مائل ہو گئے اور معنی لسان اور بیان کی قدروں پر قربان ہونے لگا۔
 ”معروضات“ کا دوسرا حصہ اُن ہی ادیبوں کیلئے ہیں۔ جنہوں نے زبان و بیان کے حسن کی
 بحالی کیلئے معنی اور مطلب کی بھلی چڑھادی۔ ملاحظہ ہو حاجتی صاحب کا یہ جملہ۔

”جن مضمونوں میں باتیں زیادہ اور مطلب چشم بدو و قریب قریب

مفقو ہوں تو خواہ اس قسم کے مضامین میں زبان کے اعتبار سے بہت ہی

کم نقائص کیوں نہ ہوں، ہم اُن کو زیورِ طبع سے آراستہ نہیں کر سکتے“

اسی ادارہ میں آگے چل کر حاجتی صاحب نثر نگاروں کو ایک اُستاد کی طرح سمجھاتے ہیں

اور انہیں ہدایت کرتے ہیں کہ۔

”عنوان کی پوری پابندی کا خیال رکھ کر صحیح اُردو میں کسی ادبی، تاریخی،

معاشرتی المختصر بے ہودہ سیاست کے سوا کسی مسئلہ پر جو چاہیں، پوری

ذمہ داری اور اختصار سے لکھیں“

تاریخ گواہ ہے کہ اکثر ادبی تحریکیں اس لئے زوال پذیر ہوئیں کیونکہ آخری ایام میں یہ

انتہا پسندی کی شکار ہو جاتی ہیں۔ مذہبی شعراء تبلیغ پر اُتر آتے ہیں، منصوفیانہ شاعری میں تو ہم

پرستی رچائی جاتی ہیں۔ سماجی شاعری صحافت بن جاتی ہے۔ غرض ایسی انتہا پسندی سے ادبی

اقدار مجروح تو ہوتے ہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اگر کسی رسالے یا اخبار میں ایسی شاعری کو زیور

اشاعت سے آراستہ کیا جائے تو اُس رسالے کے معیار کا گرنا یقینی ہو جاتا ہے۔ پروفیسر

حاجتی کے دور میں ”گلریز“ ایسی ستم ظریفی سے بچ نکلا۔ جدید شاعری کو اپنی ظریفانہ طنز کا

نشانہ بناتے ہوئے پروفیسر حاجتی شاعروں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں۔

”جہاں ہم نے مذہبی منظومات میں قل اعوذیت کی تبلیغ یا اعتذار پسندی، متصوفیانہ نظموں میں خالص پیر پرستی یا عقائد نمائی، جمالیاتی غزلوں میں ”لول ہے سدری لول ہے آم“ قسم کی بے ہودہ آہ و زاری اور سماجی اشعار میں پروپیگنڈا، سب و شتم اور فساد کو نمایاں پایا، ادبی قطعات میں غیر مربوط خیالات کی کچھڑی اور غیر مانوس الفاظ کا پلندہ دیکھا۔ تو ہم نے ان بھانت بھانت بولیوں کے ذریعے رسالہ کے معیار کو گرنے سے بچایا۔ اس سلسلے میں ابھی ہم اپنی معذوریت کا جواز ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ ہمارے پاس آزاد شاعری کا بھی ایک بھاری بھر کم بوقچہ جمع ہو گیا۔ جن میں عروضی قواعد کو بیک اشارہ ترقی پسندی بقول کسے ”کوٹ انڈیا“ کہا گیا ہے۔ ان متشاعرین سے ہماری گزارش ہے کہ جب بیلنک ورس لکھنے والے شیکسپیر کسی زبان میں پیدا ہوئے ہیں۔ تو وہ اپنی شخصیت، انفرادیت اور انسانیت منوا کر عالم بقاء کو سدھارتے ہیں۔ فی الحال آپ اس یاد دہانی کو ہماری قدامت پروری سے تعبیر کیجئے یا خلیل ابن احمد کی روح کی اثر آفرینی کہ ہم اکاسٹھ، باسٹھ، تریسٹھ، چونسٹھ، پینسٹھ، چھیسٹھ قسم کی ”موزون“ شاعری کو بھی چھاپنے سے قاصر ہیں۔

چہ جائیکہ وہ ”ابیات“ جہاں ردیف، قافیہ اور بحر کو محض اسلئے ترک کر دیا

گیا ہو کہ نوخیز ”آزاد شاعر“ نے ان کی رعایت کو بھی فرسودہ نظام کی یاد
گار سمجھ لیا ہے۔

”گلریز“ کے مالی وسائل بہت محدود تھے۔ چند بزرگوں کی مالی معاونت کے علاوہ یہ رسالہ بھکری سے حاصل آمدنی پر ہی چلتا رہا۔ ”معروضات“ کا آخری حصہ اگرچہ معاونین کیلئے ہیں۔ لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اسمیں ”گلریز“ اور اس دور کے دیگر رسائل کا ایک موازنہ نظر آئے گا۔

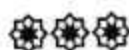
”آپ کو چند باتوں کا علم تو ہے لیکن بشریت کی سبب آپ ان کو کبھی کبھار بھول بھی ڈالتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ”گلریز“ کو کسی حکومت کا دست شفقت تھکی نہیں دیتا۔ ”گلریز“ کسی جاہ پسند ادارے کا آرگن نہیں کہ مالی امداد کی توقع پر اُن اشخاص کو اچھالے۔ جن کی شخصیت تاریخی زاویہ نگاہ سے مستحق توصیف نہیں۔ ”گلریز“ اشتہار بازوں کے ذریعہ آمدن کو محض اس لئے قبول نہیں کرتا۔ کہ ادبیات عالیہ کے ساتھ ساتھ فحش، فریب انگیز اور زُرگرانہ اشتہاروں کی طباعت و اشاعت قریب قریب ادب کی توہین ہے۔ (یہ امتیاز تمام رسائل میں سے ”گلریز“ کے حصے ہی آیا ہے!) ”گلریز“ گندھی سیاست کے گندھے کھیل کا کھلاڑی نہیں کہ اپنے کرب کو ہی ذریعہ زندگی سمجھے۔“

پروفیسر حاجتی کا یہ ادارتی مضمون اپنی علمی رنگارنگی، طنزیہ انداز اور تنوع کی بناء پر اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ اس ادارہ میں اُردو کی تاریخ بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ حالات پیش نظر ہو جاتے ہیں جن میں اُردو نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اس ادارے میں حاجتی صاحب ایک طرف قلم کاروں کو لکھنے کے آداب و اصول اور ”گلریز“ کے تقاضے سمجھاتا ہے

اور دوسری طرف اُن کی تخلیقات کو زیور طبع سے آراستہ نہ کرنے کا جواز بھی سامنے رکھتا ہے۔ اس مضمون کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی حاجتی صاحب نے تخلیقات کو نہ چھاپنے کی بنیاد پر معذورانہ انداز نہیں اپنایا ہے۔ الٹا لکھنے والوں کو ہی کوستے ہیں کہ اُن میں وہ ہنر اور صلاحیت ہی نہیں جس سے اُن کی تخلیقات ”گلریز“ کے معیار پر پوری اُتریں۔ آخر پر جب حاجتی صاحب معاونت کرنے والوں کی طرف رخ کرتے ہیں تو باتوں باتوں میں ”گلریز“ کا دوسرے رسائل کے ساتھ موازنہ پیش کر دیتے ہیں۔

جہاں تک اس مضمون کی زبان کا تعلق ہے۔ اس کی زبان علمی ہونے کے باوجود عام فہم ہے۔ اس ادارہ کا اسلوب حاجتی صاحب کا اپنا اسلوب ہے۔ اس ادارے کے اسلوب کو لوگ ”حاجتیت“ کے نام سے جانتے ہیں۔ حاجتی کا یہ اسلوب آگے اُن کے خطوط میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔

اُردو صحافت سے قطع نظر حاجتی صاحب کئی کشمیری رسائل کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ اُن میں ”سری پرتاب“ کا لُج کے ”پرتاب“ کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ شمالی کشمیر کی تہذیبی، ثقافتی و ادبی تنظیم ”ادبی مرکز کراڑ“ کی طرف سے جو رسالہ ”مشاہیر کراڑ“ کے نام سے شائع ہو رہا تھا۔ اُس کی نظر و تربیت حاجتی صاحب ایک مدت تک انجام دیتے رہے۔ بعد میں رسالے کا نام تبدیل ہو کر ”پروہ“ پڑا۔ ”پروہ“ ۱۹۸۹ء تک حاجتی صاحب کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔ یہ رسالہ آج بھی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ حلقہ ادب حاجن سوناواری کا رسالہ ”دولر کی ملز“ بھی ایک مدت تک پروفیسر حاجتی صاحب کی نگرانی میں لگا تار چھپتا رہا۔ یہ رسالہ بھی ابھی تک تسلسل کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ یہ دونوں رسائل آج کل نئے اور ابھرتے قلم کاروں کے لئے بہت بڑے پلیٹ فارم ہیں۔



پروفیسر محی الدین حاجتی

ایک مکتوب نگار

دور حاضر ایک سائنسی دور ہے۔ کمپیوٹر کی کرامات نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) بنا دیا ہے۔ سائنس کی تازہ دین نے انسانی زندگی میں قیامت خیز تغیرات پیدا کئے۔ اب بات قاصد نہیں، ٹیلی فون نہیں بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ لیکن اس گما سان کے مشینی دور میں بھی خط کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ہاں! اس کی اہمیت تھوڑی بہت مجروح ہو بھی گئی ہو۔ لیکن آج بھی دیوانے ”مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے“ کی تسبیح خوانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہاں ”کمپیوٹر کے آنے پر بھی ایک عالم رہا“ یہی خط کی اہمیت ہے۔

خطوط نگاری کا فن وہ تحریری آئینہ ہے۔ جس سے ہمیں مکتوب نگار کے طرز تحریر، زبان و بیان، اسلوب، میلان طبع، زبان پر اُس کے عبور، ابہام و ابہام اور فصاحت و بلاغت کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی اُس کی تخلیقات میں موجود استعاراتی، تشبیہاتی اور تلمیحاتی برتاؤ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر مکتوب نگار کی زندگی کے مختلف پہلو ہمارے پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ مکتوبات بھی ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ہم کسی قلم کار کی شخصیت اور ادبی

معیار کو پرکھ سکتے ہیں۔ خط اپنے دور کے سماجی، سیاسی اور معاشی رجحانات کا پتہ دیتا ہے۔
 اُردو زبان و ادب میں بھی مکتوب نگاری کا رواج ابتداء سے ہی رہا ہے۔ اُردو کے عظیم
 شعراء مرزا اسد اللہ خاں غالب اور ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ بہت اچھے مکتوب نگار بھی تھے۔ اُن کی
 عظمت کا راز اگرچہ اُن کی شاعری میں مضمر ہے۔ لیکن اُن کے خطوط بھی کسی کم پایہ کے نہیں
 ہیں۔ غالب کو اپنے خطوط کی بناء پر ہی ”حیوان ظریف“ کہا گیا ہے۔

جہاں تک پروفیسر محی الدین حاجتی کا تعلق ہے۔ وہ بھی ایک بہت اچھے اور کشمیر کے
 بہت بڑے مکتوب نگار ہیں۔ انہوں نے بہت ہی خوبصورت اور علمی و ادبی لحاظ سے اہم خط
 اپنے دوستوں کو لکھے۔ ان خطوط سے اُن کی زندگی کی مختلف جہتیں ہماری نظروں کے سامنے
 آتی ہیں۔ اور کئی اداروں اور شخصیات کا ظاہر و باطن بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اگر حاجتی
 صاحب کے خطوط کو کوئی مالک رام یا گوپی چند نارنگ ملا ہوتا، تو وہ بھی اس میدان میں غالب
 کے ساتھ آنکھ ملا سکتے تھے۔ لیکن ناداری قسمت یہ کہ حاجتی کے خطوط طاق نسیاں ہو چکے ہیں۔
 حق تو یہ ہے کہ اگر اس کتاب میں حاجتی صاحب کی مکتوب نگاری کا تذکرہ نہ کیا جائے تو
 اُنکے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ حاجتی صاحب نے اُردو میں بہت سارے خطوط اپنے دوستوں
 اور احباب وغیرہ کے نام ارسال کئے ہیں۔ لیکن ان خطوط کو حاصل کرنا دل گردے کا کام
 ہے۔ جو میرے بس سے کوسوں دور ہے۔ اس لئے میں نے مختلف کتابوں میں موجود اُن کے
 لکھے ہوئے خطوط کو جمع کر کے یہاں نمونے کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ امید
 ہے کہ راقم کی بے بسی اور کم ہمتی کو عذر متعلق سمجھا جائے گا۔

پروفیسر حاجتی کے خطوط کی زبان بھی وہی ہے۔ جس کا انہوں نے اپنی مختلف تحریروں
 میں استعمال کیا ہے۔ ہاں! اُن کے خطوط میں ایک لسانی سنگم دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے

اُردو خطوط میں کئی کئی کشمیری الفاظ و تراکیب کو ٹھونسے۔ وہی زبان، وہی انداز بیان اور اسلوب جس کے بارے میں مدیر آئینہ مرحوم شمیم احمد شمیم لکھتے ہیں۔

”حاجتی صاحب سے کچھ سے بات کرنے کے بعد وہ فقرہ یاد آتا ہے جو کسی تذکرہ نویس نے میر تقی میر پر چُست کیا تھا ”بلندش نہایت و بلند پستی غایت پست۔“ ایک ہی سانس میں ادب اور فن کے بصیرت افروز رموز، سائنس اور فلسفہ کے دقیق نکات، سیاست و فقہ کے بلخِ رمزا اپنے کھر درے دہقانی لہجے میں سلجھاتے جائیں گے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ”ہیڈ لانگ“ کر کے دُنیا بھر کی مغالطات اور انتہائی چھوٹی باتیں دہرانا شروع کر دیں گے۔ اور آپ ”یا الہی یہ ماجرا کیا ہے“ کہتے ہوئے اُن کا منہ تکتے رہیں گے۔ لیکن حاجتی صاحب کی ان گالیوں سے اُن کے جاننے پہچاننے والے خائف نہیں ہوتے۔ اس ”فنِ کثیف“ میں اُن کا ہمسرا گر کوئی کشمیر میں ہے۔ تو وہ میر راجپوری^۱ ہیں۔ دونوں حضرات گالیاں ایجاد کرنے میں ساتھ اکٹھی ایوارڈ کے مستحق ہیں۔ دونوں حضرات گالیاں دیتے ہوئے شرم اور نفاست نام کی کسی چیز سے پریشان نہیں۔ بلکہ گالی ایسے دیتے ہیں۔ جیسے دعائیں دے رہے ہوں۔ مگر مماثلت یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ راجپوری کی گالیاں اُس کی بیمار

میر غلام محمد راجپوری ایک وقت کی عوامی سرکار کا منسٹر

روح کی ڈراونی چیخیں اور اُس کے جذبہ انتقام کی نوک دار سلاخیں
 ہیں۔ حاجتی کی گالیاں بے ریا دل کی بے ہنگم موجیں اور اُس کی پیار اور
 خلوص کا بھونڈا اظہار ہے۔ اور اسی لئے جہاں راجپوری کی گالی سے
 طبیعت مکتدہ ہو جاتی ہے وہاں حاجتی صاحب کی گالی کے بعد غالب کا
 یہ شعر یاد آتا ہے

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
 گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوا۔“

پروفیسر حاجتی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسی قسم کے اندازِ بیان کو اپنے
 مکتوبات میں استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے خطوط میں ایک لمحے دُنیا جہاں کے مسائل کو سلجھاتے
 نظر آتے ہیں لیکن اگلے اقتباس میں ”بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ“ کے مصداق قاری
 کو حیران و پریشان کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔

شمالی کشمیر کی تمدنی، ثقافتی اور ادبی تنظیم ”ادبی مرکز کمراز“ کے کارکنوں اور ممبران کے
 ساتھ حاجتی صاحب کا تعلق بہت گہرا تھا۔ اکثر حاجتی صاحب اس تنظیم کے ممبران کو مختلف
 موقعوں پر خط لکھتے رہتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے انگریزی، اُردو اور کشمیری میں بہت
 سارے خطوط لکھے ہیں۔ اگر حاجتی صاحب کے خطوط کو جمع کر کے کتابی صورت دے دی
 جائے۔ تو کئی حصوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار ہوگی۔ پھر اگر اُس کتاب کی ادبی اہمیت اور
 قدر کا تعین کیا جائے تو حاجتی صاحب کے خطوط کی افادیت مارکس، غالب، اقبال یا ابو

۱ ہفتہ روزہ ”آئینہ“ شخصیات نمبر سالنامہ ۱۹۶۹ء

الکلام آزاد کے خطوط سے کم نہیں ہوگی۔ حاجتی صاحب نے اپنے خطوط میں طنز آمیز لہجہ اختیار کرنے کے علاوہ، زمانے کے حالات کی عالمانہ عکاسی کی ہے۔ محمد احسن احسن کے بقول، حاجتی کا اُردو میں لکھا ہوا تنہا انصاری مرحوم کے نام ایک خط، اتنا خوبصورت، پر معنی اور ضخیم ہے، کہ صرف اُسی ایک خط سے ایک کتاب تیار کی جاسکتی ہے، یہاں پر ایسے خطوط کو شامل کرنا ناممکن ہے۔ پھر بھی حاجتی کے طرز نگارش اور اسلوب ”حاجیت“ کو جاننے کیلئے کچھ خطوط کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اُن کی مکتوب نگاری کی مختلف جہتیں اور فنی خوبیاں واضح ہو جائیں۔

۱۹۶۸ء کا سال اور معراج النبی کا مقدس دن تھا کہ ریڈیو کشمیر سرینگر کے ڈیریکٹر شری نند لال چاولہ نے مرحوم تنہا انصاری کے نام ایک ڈی۔او۔ (D.O.) بھیج دیا کہ وہ اس موقع پر ایک منظوم فچر فوری طور پر تحریر کر کے ریڈیو کشمیر کو ارسال کریں۔ تنہا مرحوم نے دعوت قبول فرمائی۔ منظوم فچر پروڈیوسر ریڈیو کشمیر فاروق نازکی کو بھیجنے کے بعد انہوں نے حاجتی صاحب کو خط لکھ کر انہیں فچر سننے کیلئے کہا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اس فچر کے متعلق اپنے تاثرات تحریر کر کے بذریعہ ڈاک بھیجے جائیں۔ حاجتی صاحب نے فچر کو سن کر اپنے تاثرات قلمبند کر کے تنہا انصاری کو روانہ کئے۔ ملاحظہ ہو۔

”حاجن“

۲۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء

اختر المکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اما بعد! خط ملا۔ فرمائش سُنی۔ اندر کے لے پالکوں نے صرف ایک مقام پر (بَلَّغِ الْعُلَى بِكَمَالِهِ) کے بعد موسیقی کا حق ادا کیا تھا اور باقی پیشکش میں فضول موسیقی کے ذریعے آپکے اکثر الفاظ گول مول کرادیئے۔ اس ”چوہر پرور“ سٹیشن نے زنانہ آمیزش سے فہجر کے روحانی تاثر کو ”ہلکا بھلکا“ بنانے کی بھی حماقت کی تھی۔ تحریری پیش کش اور ریڈ پائی پیش کش میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ جہاں آپ نے تدریجی انداز بیان سے نفسِ مضمون کو دلفریب، رقت آمیز اور ایمان افروز بنادیا تھا۔ وہاں ساتھی ہی تبت بقال، ایسا پیشہ ور گویا بھی فہجر کا نعتیہ سرور اور فنکارانہ زیرویم (Cadence) قائم نہ رکھ سکا۔

آپ کی نثر خواص پسند ”نثر تھی۔ لیکن (جیسا کہ آپ نے خود دکھا ہے) اس مضمون کا تقاضا ہی یہی تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آپ کا یہ دعویٰ کہ ان کا دفع الی السماء نص قرآنی سے ثابت ہے۔ میرے نزدیک غلط عقیدے کا شاخسانہ ہے۔ کیونکہ اس طرح آپ ”رفع اللہ الیہ“ آیت میں ”اللہ“ کو ”السماء“ کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ جو درست نہیں۔

اختلاف تو آپ کے اسی عقیدے سے رہا۔ باقی آپ کی کوشش ادب، اسلام اور عشق محمدی ﷺ سے یقیناً مملو تھی اور میرا اندازہ ہے کہ ہر سننے

والے کا مجموعی تاثر بھی یہی ہوگا۔ آپ کی تضمین دل پسند تھی اور طرز
نگارش عالمانہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کم سے کم وقت کے اندر معراج
النبی ﷺ، ایسے بلند پایہ موضوع پر اس سے خوب تر اور مرطوب المعانی
چیز شاذ ہی متوقع ہے اور سرینگر ریڈیو چونکہ کفر، نفاق، بہتان، کذب
اور فسق کی بدبو سے گھرا ہوا ہے۔ اس لئے اگر اس کی نشریات میں کوئی
اسلامی موضوع ٹھونسا بھی جائے تو یہ محض کرامت ہے۔ کہ وہ سراسر مسخ
نہیں ہوتا۔ لہذا آپ کا فیچر اگر مجروح بھی ہوا، تو اس سے ہمیں گھبرانا
نہیں چاہیے۔ تمتہ دُعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو صحتِ کامل عطا
کرے۔ آمین

فقط تخریر الصدر

نیاز مند

محی الدین حاجنی

اس خط کو پڑھ کر حاجتی صاحب کی علمی بصیرت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے۔ ساتھ ہی
ریاست کے مختلف سرکاری اداروں کے تئیں اُن کا وطیرہ بھی سامنے آتا ہے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر
خدا کے فضل سے اُن دنوں پھر بھی، نام تو لیا جاسکتا تھا۔ لیکن آج یقینی طور پر وہ ”جو بر پرور“
ہو چکا ہے۔ عورتوں کی اتنی تعداد کہ تلاوت بھی اب اُن ہی سے کرائی جاتی ہے۔ کوئی مذہبی
پروگرام اگر شب قدر، عید میلاد النبی یا معراج النبی پر نشر کرنا ہو۔ تو زنانہ آمیزش کیا، زنانہ ہی
زنانہ ہوتا ہے۔ دور درشن کا حال خدا بہتر کریں۔ بیان کرنے کے لائق ہی نہیں۔ اس اسٹیشن

کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ اس کے اکثر پردگرا موں میں عورت کے بغیر کام ہی نہیں چلتا ہے۔ آج کے الیکٹرانک میڈیا نے تو عورت کو برہنہ کر دیا اور اس کو ایک بازاری شے بنا دیا ہے۔ عورت کا جسم آج کے دور میں برقی ذرائع ترسیل کی بھکری کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ان سبھی حقائق کو حاجتی نے صاحب آج سے بہت پہلے اپنے خط میں ظاہر کیا۔

پروفیسر محی الدین حاجتی اور دلہ بارہمولہ کے انصاری خاندان کے مراسم کافی اچھے تھے۔ اس گھرانے کے ساتھ حاجتی صاحب کا تعلق بہت گہرا تھا۔ کہتے ہیں کہ حاجتی صاحب مرحوم نے سب سے زیادہ خط اسی خاندان کے افراد کے نام لکھے ہیں۔ متذکرہ بالا خط بھی اسی خاندان کے ایک بزرگ کے نام تھا۔ اب پیش ہیں مرحوم نشاط انصاری کے نام لکھے گئے ایک خط کے چند اقتباسات۔ اس خط کے ذریعے پروفیسر حاجتی صاحب کے اسلوب کے چند اور پہلو نمایاں ہونگے۔

”حاجن

۱۴ جنوری ۱۹۷۰ء

اخى العزيز

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گمان اب یقین تک پہنچ چکا ہوگا کہ راقم الحروف نہ آنکھوں سے کام لیتا ہے اور نہ کانوں سے اور اس عندیہ کی تصدیق آپ یوں کرتے ہونگے کہ آنکھیں ہوتیں تو میرے خط کو دیکھا ہوتا۔ کان ہوتے (خود سہی) دوسروں سے میرے خطوں کی عبارت سنی ہوتی۔ آپ کے اس مفروضہ کی تردید میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں اور عرض پرداز ہوں کہ آپ

کے خطوں میں سے قریباً سب جواب کے اس قدر طلبگار نہ تھے، جس قدر عمل کے اور میرا اعمالنامہ سینکڑوں ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ جہاں میرا کام (خواہ دینی ہو یا اخروی) ادھورا ہی رہا ہے۔

آپ کے ابتدائی خط کا مضمون یہ تھا کہ میں آپ کے تبادلے کے سلسلے میں اپنا پارٹ ادا کرنے سکا۔ بد قسمتی یہ تھی کہ دو دن مارشل ڈارل کو آپ کے ساتھ سینہ، سینہ عداوت ہے اور میرے ساتھ اعلانیہ۔ پھر بھی میں نے جب آپ کی مرسولہ ملامت کو آزاد صاحب کے نیم گنجاسر پر سود مرکب کے ساتھ تھوپ دیا تو اُس وقت آپ ”کریری“ پہنچائے گئے تھے اور میرا غیض و غضب بقول کے ”اپے تھس“ (Apathes) ہو کر رہ گیا۔“

اس خط میں پروفیسر حاجتی نے کشمیر کے کچھ اہم اور تاریخی مقامات کا ذکر بھی سرسری طور پر کیا ہے۔ علاوہ ازیں چند اہم عہدوں پر فائز شخصیات کی کشمیر دشمنی کا ذکر بھی غیر محسوس طریقے سے کیا ہے۔

”ڈوگرہ سیکریٹری کو میں خود تفصیلات سنا کر زیادہ سے زیادہ عطیہ کی ادائیگی پر مائل نہ کر سکوں گا۔ آپ نے اس بارے میں میرے ساتھ اتفاق بھی کیا

۱۔ غلام رسول ڈار۔ اُس وقت کے ڈپٹی ڈیکریٹر محکمہ تعلیم

۲۔ غلام رسول آزاد۔ سابقہ ناظم تعلیمات جموں و کشمیر

تھا، لیکن بیٹہ مالواڑے کی گونا گوں خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں کی بات بس کی رفتار سے کافور ہوتی ہے۔“

تنہا انصاری کی وفات کے بعد پروفیسر حاجتی دل برداشتہ ہونے کے علاوہ بہت حد تک عدیم الفرست بھی ہو گئے تھے۔ اس لئے دلہ کے انصاری خاندان کے یہاں آنا جانا تھوڑا کم ہو گیا۔ اسلئے اس خط میں آگے حاجتی کا انداز معذورانہ ہے۔ لیکن انداز تو دیکھئے۔

”مجھے توقع ہے کہ آپ اور جنت نشان تنہا کے بچے مرحوم و مغفور کے شکیب آزمائش میں ہمیشہ برابر کا شریک تصور کریں گے۔ خدا نے اگر مجھے گونا گوں مصروفیتوں اور خواہ مخواہ کی پریشانیوں میں گرفتار نہ کیا ہوتا تو آپ کی دلجوئی نہ سہی کم از کم اپنا ذہنی اضطراب ہی ہلکا کرنے کے لئے گذشتہ سال ایک یاد و دفعہ اپنے محبوب بھائی کی قبر پر آنسو بہانے ہی کے غرض سے آیا ہوتا۔ یہ تغافل یقیناً ایک ایسا سہو ہے۔ جو کسی عذر پذیری سے ہی رفع نہیں ہو سکے گا۔

فقط تحریر الصدر

نیاز مند

حاجتی“

اس خط کی زبان اور اس کا اسلوب مرزا غالب کی یاد تازہ کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، گسی ہوئی باتیں، معذرت میں بھی معیار، حاکمانہ لہجہ یہی ہے محی الدین حاجتی کا حاجتی

اسلوب۔ کاش ان خطوط کو جمع کر کے ایک کتابی صورت میں شائع کیا جاتا، تو پروفیسر حاجتی کا معیار نئے سرے سے متعین کرنا پڑتا۔

پروفیسر حاجتی کے بارے میں کچھ لوگوں نے عدوانا یا محبتاً ایک رائے قائم کر لی تھی، وہ یہ کہ پروفیسر حاجتی اپنے افراد خانہ کے معاملے میں غفلت برتتے تھے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ اپنے فرزند واحد کی انہیں بہت کم فکر رہتی اور وہ اُس کے مستقبل اور دیگر معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اب یہاں میں پروفیسر حاجتی کے محمد احسن احسن کے نام لکھے ہوئے ایک خط کو پیش کرتا ہوں۔ یہ خط پروفیسر حاجتی نے جموں جیل سے احسن صاحب کے نام لکھا تھا۔ اس خط سے اُس مفروضہ کی تردید ہوتی ہے کہ حاجتی صاحب اپنے افراد خانہ کے تئیں غیر ذمہ دار تھے۔

”جموں“

عزیزی محمد احسن
اسلام علیکم۔ اما بعد

آپ کے خط کو پڑھ کر مجھے افسوس نہ ہوا۔ کہ سال روانہ میں یونیورسٹی نے آپ کو امتحانِ کامل میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ میں نے کوئی تین ماہ پہلے یہاں سے رجسٹرار صاحب کو ایک خط لکھا تھا۔ کہ انہوں نے کیسے ۱۹۶۷ء کے بجائے ۱۹۶۶ء ہی میں کامل امتحان کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی خط میں میں نے اس سے پوچھا تھا۔ کہ درخواست پیش کرنے کے بعد بھی آپکے اور حلیمہ کے اختیاری پرچہ کا نتیجہ کیوں تا حال شائع نہ کیا گیا۔ اب جو آپ کے خط سے معلوم ہوا۔ کہ میری ارسال

کردہ فہرست نصاب بھی یونیورسٹی کے دفتر میں نظر نہیں آئی۔ تو میں حیران ہوا۔ حالانکہ چستی صاحبؑ نے مجھے اس فہرست کے جواب میں اطلاع کر لی ہے۔ کہ میری پیش کردہ فہرست رکی منظوری میں پیش ہوگی۔ حیرانی کا مقام ہے۔ کہ متعلقہ سیکشن میں یہ فہرست ہی ناپید ہے! مزید برآں میں نے آج تک دو دفعہ آپکو اپنی تجویز کردہ فہرست کتب کی نقل بھیج دی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اغلب ہے کہ ان میں ذرا سا ہیر پھیر کیا جائے۔ لیکن آپ کے حالیہ خط سے محسوس ہوتا ہے۔ کہ آپ کے پاس دو دفعہ ارسال کردہ فہرست پہنچی ہی نہیں۔ کیا آپ اس گرہ کو کھول سکیں گے؟ یعنی یہ کہ کیا آپ نے میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو فہرستوں میں سے ایک بھی نہ پائی۔ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو ایک طرف تو ان خطوں کی گمشدگی پر مجھے افسوس ہوگا۔ دوئم یہ کہ اس فہرست کی نقل میں نے موجود ہی نہیں رکھی ہے۔ مجھے تو پھر کئی دن اور سوچنا پڑے گا اور مختلف اطراف سے مشورہ لینا ہوگا۔

۲۔ حلیمہؑ کے متعلق میرا یہی فیصلہ ہے۔ کہ فی الحال وہ ”ماہر کی تعلیم جاری رکھے۔ اگر خدا نہ کرے میں امتحان شروع ہونے تک حاجن پہنچ نہ سکا تو ۱۶ جولائی سے ہی وہ ”کامل“ کی تیاری کرے۔

۱۔ اس وقت کے ڈپٹی رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی

۲۔ حلیمہ پروفیسر حاجن کی دختر

- ۳۔ چونچہ بردار صاحب سا کیا اپنے پیشتر و کے نقش قدم پر چلتے چلتے سبک رفتار بنا ہے یا انسانوں ہی کی طرح چلتا ہے۔
- ۴۔ امینؑ کے گرم مطالعے کے متعلق آپ کے سوا کوئی تعریف نہیں لکھتا۔ لیکن عزیز می عبدالرحمانؑ کے بارے میں جو غفلت آپ نے اور دیگر اساتذہ نے برتی ہے۔ وہ مذمت کی مستحق ہے۔ صفائی سننے کی ضرورت نہیں۔

آپ کا بھائی
محی الدین حاجنیؑ

پروفیسر حاجنی صاحب کے ان خطوط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ظریفانہ اندازِ اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں حاجنی کے خطوط سے حکومتِ وقت کے ساتھ اُن کی تلخیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے بھائی کو ”چونچہ برادر“ کہتے ہیں۔ وہی ”ریڈیو کشمیر چونکہ کفر اور فسق کے بدبو سے گرا ہوا ہے“ یا ”ڈوگرہ سیکریٹری کے ساتھ کسی قوم فروش بھی خواہ کے ذریعے رابطہ کیا جائے“ جیسے جملے قابلِ غور ہیں۔

حاجنی صاحب کے متذکرہ بالا خطوط میں ”جو بر پرور، زنانہ آمیزش، فسق، بدبو، اندرا کے لے پالک، دودنما، نیم گنجا، سود مرکب، کبک رفتار جیسے مخصوص الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۱۔ غلام حسن پرے حاجنی صاحب کے چچا زاد بھائی

۲۔ محمد امین پرے حاجنی صاحب کے اکلوتے فرزند

۳۔ عبدالرحمان حاجنی صاحب کے ایک اور چچا زاد بھائی

ان الفاظ کو وہ اکثر و بیشتر اور عام طور پر اپنی تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ ان ہی الفاظ کی بناء پر اُن کا اندازِ تحریر منفرد اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی اسلوب کا نام ”حاجنیت“ ہے۔

جیسے کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ پروفیسر حاجتی صاحب نے صرف اُردو اور کشمیری میں ہی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو خط نہیں لکھے، بلکہ عربی اور انگریزی میں بھی ایسے گراں قدر اور پر مغز خطوط لکھے ہیں جو اُن کے عالم ہونے کی سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے خطوط کو موضوع کی مناسبت سے اس کتاب میں شامل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

امید یہ کی جاسکتی ہے کہ پروفیسر حاجتی کے عزیز واقارب اور کشمیری لسانی تحریک سے وابستہ لوگ ان خطوط کو جمع کرنے کی مہم شروع کریں گے۔ اس بات میں کوئی دیر اے نہیں کہ اس قسم کے قدم سے کشمیری زبان و ادب کی لسانی تحریک کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ حاجتی صاحب کی ایک نئی توضیح سامنے آئے گی۔



جوہم سمجھے

پروفیسر محی الدین حاجتی کی حیات اور اُن کے ادبی کارناموں پر لکھا گیا یہ مقالہ اب لگ بھگ مکمل ہو چکا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ مقالے میں عام اور رائج زبان استعمال ہو۔ پورے مقالے میں ضرور ایسی باتیں ہوں گی۔ جنہوں نے آپ کے دل کو چھوا ہوگا۔ کئی بار آپ کے نظریات کے ساتھ تضاد بھی ہوا ہوگا۔ میں اب اُن چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا، جن باتوں کو میں تقسیم حاجتی کے سلسلے میں خاص اور اہم محسوس کرتا ہوں۔ یہ اہم نکات درج ذیل ہیں :

☆ پروفیسر حاجتی ایک ان پڑھ اور زمیندار گھرانے میں پیدا ہو کر علم و ادب کی معراج تک پہنچ گئے۔

☆ پروفیسر حاجتی بہت ہی حساس اور حاضر جواب انسان تھے۔ اس حساسیت نے اُن کے مزاج کو لا اُبالی بنایا تھا۔

☆ حاجتی صاحب ایک سچے مسلمان اور معتقد تھے۔ اس لئے وہ فضول چیزوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن مہمان کی آمد پر گھر میں عید مناتے تھے۔

☆ پروفیسر حاجتی صاحب ایک ذہین اور مخفی طالب علم تھے۔ علی گڑھ میں ایک ساتھ کئی ڈگریاں حاصل کر کے اور پھر یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے سے کتاب الطوا سین کو زبانی یاد کرنے کے بعد نقل کر کے انہوں نے یہ بات ثابت کر دی۔ انہیں علم حاصل کرنے کا انتہائی حد تک شوق تھا۔

☆ حاجتی صاحب نے عربی زبان کی صوفیانہ شاہکار ”کتاب الطواصین“ کی اردو میں تشریح کر کے اردو زبان کے دامن کو وسعت بخشی۔

☆ حاجتی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری زبان و ادب کے دلدادوں کے سامنے کشمیری شعراء اور ادیبوں کی زندگی اور کارناموں پر قلم اٹھا کر اردو زبان میں پیش کیا۔ اور ہندوستان کے اردو داں طبقے کے سامنے کشمیری شعراء اور ادیبوں کے کارناموں کو پیش کیا۔ اس طرح انہوں نے کشمیری اور اردو کے درمیان حائل دیواروں کو مٹا کر انہیں بغل گیر کر دیا اور دونوں زبانوں کی ناقابل فراموش خدمت کی۔

☆ موضوع کوئی بھی ہو، لیکن پروفیسر حاجتی کے مضمون میں کشمیریوں کا درد و کرب رقص کنناں نظر آتا ہے۔ وہ کشمیریوں کی بار بار کی خرید و فروخت کا ذکر کئے بغیر رہ ہی نہیں پاتے ہیں۔ حاجتی صاحب بے حال، غریب اور لاچار کشمیریوں کے بہت بڑے غم گسار تھے۔

☆ حاجتی صاحب نے کشمیر میں اردو میں پچاس کے عشرے میں انشائیے لکھے۔ حالانکہ اُن کے بعد اس صنف میں بہت کم پیش رفت ہوئی۔ حاجتی صاحب کے انشائیے طنز و مزاح سے لبریز، مودبانہ ظرافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

☆ حاجتی صاحب ایک ٹھوس صحافی ہونے کے علاوہ ایک منفرد ادب نواز پروفیسر تھے۔ وہ صرف رومانی ادب اور ادبی نعرہ بازی کے قائل نہ ہونے کے علاوہ عروض و اوزان سے چھٹکارہ پانے والوں سے بھی بیزار تھے۔ وہ کئی رسائل کے ساتھ وقتاً فوقتاً وابستہ رہے۔

☆ حاجتی صاحب بہت اچھے مکتوبات نگار بھی تھے۔ اُن کے مکتوبات میں دنیا جہاں کی باتیں بیان ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی یہاں کے مختلف سرکاری اور نیم

سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کے تئیں اُن کا وطیرہ بھی سامنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے خط مختلف شخصیات کو پردوں سے نکال کر بے پردہ بھی کرتے ہیں۔

☆ حاجتی صاحب نے اپنی تخلیقات میں ایک خاص اور منفرد اندازِ بیان کا استعمال کیا ہے۔ اندازِ بیان کی انفرادیت کی بناء پر ہی ڈاکٹر مشعل سلطانی پوری نے اُن کے اسلوب کو ”حاجنیت“ کا نام دیا ہے۔ یہ اسلوب حاجتی صاحب کی تقریباً سبھی تخلیقات میں استعمال ہوا ہے۔

☆ جموں و کشمیر کی سیاست سے پروفیسر حاجتی صاحب کو سوں دور رہتے تھے۔ وہ یہاں کی سیاست اور سیاست دانوں سے بیزار رہا کرتے تھے۔ اس کا خمیازہ انہیں دو بار جیل جا کر بھگتنا پڑا۔

☆ پروفیسر حاجتی صاحب آفتاب نہیں، بلکہ اندھیری رات میں ایک چمکتا ہوا چاند تھے اور چاند پر داغ اُسکی بد صورتی میں نہیں، بلکہ خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ حاجتی صاحب گالیاں دینے میں بے مقابل تھے۔ اپنا نقطہ نظر منوانے میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنا، اُن کے دوستوں کو کھٹکتا تھا۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں تاش کھیل کر وقت گزاری کرتے تھے۔ علاوہ ازیں صحت کے متعلق لا پرواہی اور تمباکو حد سے زیادہ پینا اُن کے عاداتِ یکتا تھے۔

☆ حاجتی صاحب عربی کے عالم اور اُستاد تھے۔ لیکن اُن کی گرفت فزیکس (Physics)، کیمسٹری (Chemistry)، علمِ نباتات و جمادات (Life Science)، تاریخ (History)، سیاسیات (Pol. Science) (جغرافیہ، انگریزی، اردو اور فارسی کے علاوہ ریاضیات (Mathematics) پر بھی تھی۔

☆ حاجتی صاحب ایک خلوص مند اور دیانت دار اُستاد تھے۔ انہوں نے ہمیشہ

اپنے پیشہ کو فرض سمجھ کر اس کے ساتھ انصاف کیا۔

میں اس کتاب کو اتنی طوالت نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن شاید عقیدت یا کسی حق ادائی کی خاطر میں اپنے مقررہ احاطے سے باہر نکل گیا۔ اب مزید طوالت کو کھینچتے ہوئے، وقت اور فرصت کے لحاظ کو بچا کر اس کتاب کا اختتام حاجتی صاحب کے ایک قریبی دوست کے ان حقیقت پسند جملوں سے کرتا ہوں۔ جو انہوں نے حاجتی صاحب کے رحمت حق ہونے سے تقریباً نصف صدی قبل قلمبند کئے تھے۔ یہ کچھ جملے پڑھ کر پڑھنے والوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ جہلم کے کنارے، حاجن کے پرے خاندان کا کون سا اور کیسا فرزند ارجمند آرام فرما ہیں۔ یہ چند جملے اُن کی عظمت کی ایک ایسی دستاویز ہے جو ہمیشہ جاوید رہے گی۔ اور وقتی بغاوتوں اور تفاوتوں کے دھارے اس کو کبھی بھی مغلوب نہ کر سکیں گے۔

”ہمارے یہ الٰہی دوست نہ مولوی ہیں نہ مفتی۔ نہ معلم اخلاق ہیں نہ لیڈر۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں قل اعوذیت کے شدید مخالف۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو ادب پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ وہ دورِ حاضر کے سائنسی علوم میں بھی بدطولی رکھتے ہیں۔ وہ انشاء پر داز بھی ہیں اور نقاد بھی۔ تاریخ، جغرافیہ، لسانیات، دینیات، عمرانیات، ریاضی، طبیعیات، ہیئت۔ آپ جس موضوع پر اُس سے گفتگو کرنا چاہیں وہ اس موضوع کے ایک ایک پہلو پر اس طرح بحث کریں گے کہ آپ اُن کی ہمدانی کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک بات ضرور ہے اپنے نقطہ نظر کو منوانے کے لحاظ سے وہ ہمیشہ سے انتہا پسند واقعے ہوئے ہیں۔ طرز استدلال کا دل نشین انوکھا پن اُن کی گفتگو کا طرہ امتیاز ہے۔ وہ ہر قسم کے مباحث میں ایک نرالی جدت پیدا کرنے کے قائل ہیں۔“

گلاب اور گل قند ماخوذ از یادوں کے آنسو غ۔ م۔ طاؤس

۱

کتابیات

نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب / مدیر	سال اشاعت	پبلشر
۱	شیراز حاجی نمبر	اختر بشیر	۱۹۹۳ء	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویج
۲	حرف خوب	انصاری نشاط	۱۹۹۶ء	نشاط پبلکیشنز دلہ
۳	محی الدین حاجی ہندوستانی ادب کو معمار	انصاری نشاط	۱۹۹۶ء	ساتھیہ اکادمی، دہلی
۴	بازیافت	آزادہ محمد زماں (مدیر اعلیٰ) مفتخر مجید (مدیر)	۱۹۹۲	شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی
۵	جموں و کشمیر میں اردو ادب کا نشوونما	پریمتی ڈاکٹر برج	۲۰۰۰ء	
۶	وہلر کرملر حاجی نمبر	حاجی عزیز تسکین غلام حسن نیا زشاء اللہ	۱۹۹۸ء	حلقہ ادب سوناواری حاجن
۷	پر تاب (فائل)	حاجی محی الدین (نگران)	۱۹۵۳ء، ۵۴ء	سری پر تاب کالج سرینگر
۸	دیوان وہاب	حاجی محی الدین		جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویج

۹	کلیاتِ اسد پرے	حاجتی محی الدین	۱۹۹۶ء	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آف آرٹ، کلچرل اینڈ لنگویج
۱۰	گریز (فائل)	حاجتی محی الدین عبدالحق برقی	اپریل ۱۹۵۳ء تا اگست ۱۹۵۳ء	بزمِ ادب کشمیر
۱۱	گریز (فائل) ماہنامہ	حاجتی محی الدین	اگست ۱۹۵۳ء تا اپریل ۱۹۵۵ء	بزمِ ادب کشمیر
۱۲	کاشغر شاعری	حاجتی محی الدین	۱۹۶۰ء	ساتھیہ اکادمی، دہلی
۱۳	کوشنر	رہبرادتا کرشن خیال غلام نبی	۱۹۶۷ء	جموں و کشمیر کلچرل اکادمی
۱۴	وہاب پرے ہندوستانی ادب کے معمار	ساقی موتی لال	۱۹۹۶ء	ساتھیہ اکادمی، علی
۱۵	پڑو (حاجتی نمبر)	سلطانپوری ڈاکٹر مشعل انصاری نشاط احسن محمد احسن	۱۹۹۶ء	ادبی مرکز کمر از سوپور

۱۶	کشمیر میں اردو جلد ۳	سر درجی عبدالقادر	۱۹۸۴ء	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آف آرٹ، کچنرل اینڈ لنگویج
۱۷	کاشمیر ادبک تواریخ	شوق شفیق منور ناجی	۱۹۹۲ء	شعبہ کشمیری کشمیر یونیورسٹی حنٹر تیل سرینگر
۱۸	ہفتہ وار آئینہ سالنامہ (شخصیات نمبر)	شہسہم احمد شہسہم	۱۹۶۹ء	
۱۹	یادوں کے آنسو	طاؤس غلام محمد	۱۹۸۵ء	
۲۰	گلریز فائنل ماہنامہ	کامل محمد امین	نومبر ۱۹۵۲ء ۳ مارچ ۱۹۵۳ء	بزم ادب کشمیر سرینگر
۲۱	ہمارا ادب (لوک ادب نمبر)	نازجی رشید	۷۶-۱۹۷۵ء	جموں و کشمیر کچنرل اکادمی
۲۲	محفل اقبال	نازجی رشید	۱۹۷۸ء	جموں و کشمیر کچنرل اکادمی



کچھ مصنف کے بارے میں



محمد شفیع وانی

شاگرد شفیع

محمد یوسف وانی

وارڈ نمبر ۳ بونی کھن حاجن بانڈی پورہ کشمیر

ایم۔ اے اردو (گولڈ میڈلسٹ) T, SLET

لیکچرر محکمہ اسکولی تعلیم جموں و کشمیر

جنرل سکریٹری حلقہ ادب سوناواری

ممبر عاملہ ادبی مرکز کمر از جموں و کشمیر

مہتمم دارالعلوم اسلامیہ حاجن

ممبر نصابی مشاورتی کمیٹی جموں کشمیر اسٹیٹ بورڈ

مستقل مشاورتی ممبر اسٹیٹ انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن کشمیر

سرماہ دین (۲۰۰۶)

نام

قلمی نام

ولدیت

سکونت

تعلیم

پیشہ

رکنیت

تصنیف

973-93-30691-44-2

Meezan Publishers & Distributors

Opp. Fire & Emergency Services HQS Batamalo

Srinagar Kashmir-190009

Ph / Fax: 0194-2457215 | Cell: 9419002212 | 8494002212 7006773403

E-Mail: meezanpublishers@gmail.com | @radiffmail.com